وقت کی قید سے
ثروت زہرا

ثروت زہرا کی اس کتاب کا شعری منظر نامہ آشوب ذات سے لیکر کائنات کے خط استواء (یہ ترکیب ثروت زہرا کی ہی وضع کردہ ہے) تک پھیلا ہوا ہے۔ اس منظر نامے کے خدوخال نظر افروز بھی ہیں اور فکر انگیز بھی۔ نظمیں پڑھتے ہوئے آنکھوں میں تصویریں بنتی ہیں جیسے کوئی مصور ذرا جلدی میں ہو اور برش سٹروک سے کینوس پر نئے سے نیا منظر بنا رہا ہو۔ یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ منظر تو ایک ہی ہے کوئی صرف زاویے بدل بدل کر اسے دیکھ یا دکھا رہا ہو۔ ثروت زہرا اپنے شعری سفر میں اپنی آنکھ کے ہفت آئینے میں وجود، ذات، دنیا، کائنات اور اسکے مظاہرات کے کتنے ہی عکس ابھارتی ہے جو ایک دوسرے سے جدا جدا بھی ہیں اور آپس میں جڑے ہوئے بھی ہیں۔ ہر عکس میں شاعرہ کے انتہائی ذاتی مشاہدے اور تجربے کا رنگ نمایاں ہے۔ ہر نظم کسی لگی بندھی یا رواج یافتہ سوچ اور کلیشے سے آزاد نظر آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی فکر طبع زاد اپنی دریافت کے سفر میں ہے۔

آفتاب اقبال شمیم

وقت کی قید سے

ثروت زہرا

حلّاج پبلی کیشنز۔ کراچی

کتاب وقت کی قید سے
شاعرہ ثروت زہرا
باہتمام نثار منصور۔حسین حلاّج آغا
کمپوزنگ اُردو آرٹ انٹرنیشنل ،اُردو بازار کراچی
سروق اریب صدیقی
اشاعت اگست 2013ء
رابطہ www.sarwatzehra.com
فون نمبر 00971508256432
قیمت -/200روپے

انتساب

اپنی پیاری بہن

عظمیٰ زیدی

اور

بچوں حسین حلاج، مریم

کے نام

فہرست

☆☆☆

8

ثروت زہرا کی نظم نگاری

ثروت زہرہ کی نظموں کو پڑھنے کے بعد میں کچھ مخمصے میں پڑ گیا۔ مجھے لگا کہ میں یہ طے نہیں کر پا رہا ہوں کہ انہیں کس نکتۂ نظر سے دیکھ کر ان پر کچھ لکھا جائے۔ عموماً مجھ جیسا نیم شاعر، نیم نقاد لیکن پورا قاری نظموں کو پڑھ کر پہلے ان کا لطف اٹھاتا ہے، پھر ان کے بارے میں سوچتا ہے، پھر اپنی بصیرت کو بروئے کار لا کر تنقید کی لگی بندھی تکنیکی زبان میں ان پر اظہار خیال کرتا ہے۔ Value Judgement دینے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے بھی اس سے احتراز کرتا ہے اور کچھ ایک جملے مثبت انداز میں لکھتے ہوئے کتمان کی دبی زبان میں کچھ منفی اشارے بھی کر جاتا ہے۔ ثروت زہرہ کے ہاں کچھ بھی ایسا نہیں ہے جسے میں قالین کے نیچے چھپانے کی کوشش کروں گا، لیکن جو کچھ ہے وہ کئی سطحوں پر بحث کی زد میں لایا جا سکتا ہے۔

موضوعات، مضامین اور معانی کی سطح پر بحث سے قبل شاعر کے طریق کار کو دیکھنا کچھ عجیب سا محسوس ہوتا ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ شاعرہ چونکہ بنیادی طور پر غیر مروج تشبیہات اور

استعارات کو بہ احسن وخوبی استعمال کرتی ہیں، اس لیے ان پر پہلے بات کر لی جائے۔تشبیہ بنیادی طور پر ہم طرحی یا ہم رنگی کی مشابہت ہے۔تماثل، تشاکل اور تجنیس (لفظی یا خطی) بھی اسی قماش کے ہنر ہیں۔ امیج سے آگے بڑھیں تو خشت در خشت پرتوں کی تعمیر میں قیاس، قیافہ، التباس و انطباق ۔۔ان سب عوامل کے توسط سے ہم استعارہ سازی کرتے ہیں۔ بقول غالب

بسانِ کاغذ آتش زدہ، نیرنگِ بے تابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر

ثروت جدید شاعرہ ہیں لیکن 'جدیدیت' کی اس حد تک حامی نہیں ہیں کہ وہ افشار و انتشار پر تکیہ کرتے ہوئے اپنے نفسِ مضمون سے ہی بھٹک جائیں۔ان کے ہاں تجریدی آرٹ کے وہ جدید فیچر نہیں ہیں، جن سے شئی یا مشابہت سے آگے بڑھ کر کسی فوٹو گراف کی غیر مساوی خصوصی طور پر ایسی وسیع الذیل تصویر پیش کی جاتی ہے کہ اصلی تصویر اس میں دکھائی ہی نہیں دیتی یا تصغیریہ کی سطح پر اسے minimise کرتے ہوئے ایک لایعنی نقطہ بنا دیا جاتا ہے۔ وہ اگر آرٹسٹ ہوتیں تو بھی شاید سرّیلزم پر تکیہ کرنے کے بجائے representational painting کرتیں لیکن کہیں کہیں سرّیلزم کا سہارا بھی لے لیتیں۔ان کی سطر کی کشید نسبتاً مختصر ہے، لیکن لخت لخت سطور کے التزام کے باوجود ان کی نظموں میں تسلسل ہے، استحکام ہے، پائداری ہے، - Organic Unity ہے ۔ اگر بو قلمونی یا رنگا رنگی ہے تو وہ بھی اس توافق کو مجروح نہیں کرتی۔ اس لحاظ سے ان کے ہاں استعارے کی سطح پر "مشبہ بہ" اور "مشبہ" میں one-to-one-equation بخوبی موجود ہے۔ اگر موضوعاتی سطح پر وہ ایک آگاہ شاعرہ ہیں تو اسلوبیاتی سطح پر بھی وہ زبان و بیان کے رموز سے واقف ہیں۔

آئیے، کچھ مثالیں دیکھیں:

انٹرنیٹ استھان پہ بیٹھی خواب کی ملکہ
مخمل سی پوروں سے کتنے روز بنو گی؟
خواب۔ کی ریکھا
رنگِ رنگیلے بیر بہوٹی جیسے لفظوں کی انگنائی
جلتی بجھتی تصویروں کی خواب سرائی
ثابت انگور کے دانوں جیسے
دنیا کی یہ ہوش ربائی
تنہائی کی گاگر سے پھر لمحہ چھلکا
انٹرنیٹ استھان پہ بیٹھی خواب کی ملکہ

میں لکھ چکا ہوں کہ ''مشبہ'' اور ''مشبہ بہٗ'' میں مماثلت ضروری ہے۔ تشبیہہ اور استعارے میں یہی ایک فرق ہے کہ موخرالذکر میں دونوں objects برقرار رہنے دیے جاتے ہیں، لیکن موافقت کو ظاہر کرنے کے لیے ''جیسا''، ''جیسی'' ''سا'' ''سی'' کی گانٹھ لگا دی جاتی ہے۔ ''مخمل سی پوروں''، ''بیر بہوٹی جیسے''، ''انگور کے دانوں جیسے'' تشبیہ کی اس خصوصیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ جب کہ استعارے میں ایک object کی شکل وصورت یا قدر و قیمت کو رہنے دیا جاتا ہے لیکن اس کا نام یا عنوان جادو کی چھڑی سے جیسے غائب کر دیا جاتا ہے۔

ایک دوسرا طریق کار جو شاعرہ نے بخوبی استعمال کیا ہے وہ اسم کو صفت کے طور پر استعمال کرنے کا ہے۔ ''شعور سیڑھی'' اسی قبیل سے ہے۔ لیکن ان کے ہاں ایک اور طریق کار کا استعمال بکثرت ملتا ہے۔ اس میں غیر مصور کانسیپٹ کے ساتھ مصور عمل کو منسلک کر دیا جاتا ہے۔ یہ سطور اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

''بے محابہ رنگ''، ''بے ذائقہ ادوار''، ''مقروض بوسے''، ''کاغذی جذبے'' تو مجرد تمثالیں ہیں، لیکن مرکب تمثالوں کی بھی کمی نہیں ہے۔

- درد کے پیالوں میں ضبط چن دیا گیا ہے، کھا لیجیے
- خواب کی ریوڑیاں چباتے ہوئے زبان کٹ گئی ہے، ذائقہ لیجیے
- وجود کی کھال میں لمس کا بھس بھر دیا گیا ہے، بچا لیجیے
- درد کے پھٹے دودھ کی روشنی آسمان سے صحن تک بچھا دی گئی ہے، پتلیوں میں چھپا لیجیے

اس سلسلے میں شاعرہ ان کیاریوں میں سے بھی گل کترتی دکھائی پڑتی ہیں، جنھیں عرف عام میں 'غیر شاعرانہ' تصور کیا جاتا ہے۔ میں نے خود چونکہ ''جسم کی جیومیٹری'' اور ''میں زاویہ قائمہ نہیں ہوں'' جیسی ایک درجن کے قریب نظمیں لکھی ہیں، اس لیے میں ان کا ترش و تلخ ذائقہ محسوس کر سکتا ہوں۔ اس میدان میں، اپنے پیشے کے لحاظ سے ثروت شاید مجھ سے بھی کہیں آگے ہیں۔

میں تمھارے ہمراہ رقص کرنا چاہتی ہوں
اور مربع، مثلث اور دائروں کے زاویے
میری آزادی کا مذاق اڑا رہے ہیں
میں سوچتی ہوں
زندگی لگارتھم کا مسئلہ نہیں
جسے کوئی قیمت بتا کر حل کر لیا جائے!

'لگارتھم' یعنی logarithm کا اردو نعم البدل کیا ہے، میں نہیں جانتا لیکن 'قیمت' کا انگریزی متبادل value ہے جسے علم الحساب میں ایک خاص معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ''شیزوفرینیا'' یعنی ذو جہتی یا سہ جہتی یا بسیار جہتی شخصیت کا تصور نفسیات کے ڈسپلن سے لیا گیا ہے، لیکن اس عنوان کے تحت نظم میں ہمیں اس طرح کی سطریں ملتی ہیں۔

میں کوہِ قافِ ازل پہ بیٹھی
شعور سیڑھی کو کھینچتی ہوں

مرے زمانے کھسک رہے ہیں

حروف رستہ بھٹک رہے ہیں

تمام ہند سے کھٹک رہے ہیں

یہ خواب دامن جھٹک رہے ہیں۔

کسی دیگر طریق کار کی غیر موجودگی میں مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ طریق کار کی سطح پر کئی منظومات کے متن میں ایسے فکری اور شعری ائتلاف ہیں جو استعاروں کی مختلف سطحوں پر علیحدہ معنویت لیے ہوئے وارد ہوتے ہیں۔ مرکب تمثالیں بھی ہیں، مخلوط بھی اور مجرد بھی۔ کہیں کہیں ان کی ادلا بدلی اور بہم دگر انضمام میں مجرد مخلوط اور مجرد مرکب تمثالیں بھی معرض وجود میں آتی ہیں۔

طریق کار کے ذیل میں ایک اور بات نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ثروت نظموں کے تراش میں سطر کو تو ایک اکائی سمجھتی ہی ہیں، لیکن کئی بار سطر اس قدر مختصر ہوتی ہے کہ وہ ایک قاش کی طرح دکھائی دیتی ہے، اور خود میں غنائی جہت کو سمو سکنے کی قوت کھو بیٹھتی ہے، یہ شاید اس لیے ہے کہ مختصر نظم طویل سطور کو برداشت کرنے کی اہل نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ کچھ اور بھی ہو سکتی ہے، جس کو زیر بحث لانے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن انگریزی شاعری میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔

E.E. Cummings نے لکھا تھا کہ اس کے سوچنے کا انداز بھی اس کی نظموں کی ہیئت کی طرح ہی ریزوں، ٹکڑوں اور قتلوں pieces, bits and fragments میں بٹا ہوا ہے۔ گویا اس نے ہیئت کو (سطروں کی تراش کے حوالے سے) تخلیقی قوت کا ظاہری نتیجہ تسلیم کرتے

ہوئے خود پر ہی اس بات کا اطلاق کیا تھا کہ اس کے سوچنے کا ڈھنگ ''لخت لخت'' ہے۔ ثروت کی 'لخت لخت' منظومات پڑھتے ہوئے راقم الحروف کو تو ایسی کوئی بات دکھائی

نہیں دی جس سے یہ حتمی نتیجہ فرض کر لیا جائے کہ ان کے ذہن میں شعری انکھوے پھوٹنے کا منظر نامہ ایک ثابت و سالم تجربہ نہیں ہے۔ سبھی نظریہ ساز نقاد کم از کم اس مفروضے پر متفق ہیں کہ form کو subject پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔ اس لحاظ سے مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے، کہ ثروت صاحبہ کے ہاں ہیئت کی لخت لخت خوش نمائی ان کے شعری تجربے کا ''اظہاریہ'' ہے نہ کہ تخلیقی لمحے کے وقت کا ذہنی ''افشاریہ''!

صرف ایک مثال دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

میں بے یقینی کے سرد موسم میں
برف لمحوں سے مر رہی ہوں
گمان پہنے صراط دل پر
سنبھل کے....
خود میں پگھل رہی ہوں
کہاں تلک ہو
غلام و آقا کی پاسداری
کہاں سے آئی یہ میری
''میں'' کی لہو سواری
رہائی دے دے....
میں سانس باندھے
بہت دنوں سے
حضور دل کے
کھڑی ہوئی ہوں

ہیئت سے مراد جہاں بہت کچھ اور بھی ہے، وہاں عروضی ارکان کی بنیاد پر، یا اس سے انحراف

کرتے ہوئے، سطروں کی تراش خراش ہے۔ عام طور پر کسی بھی شاعر میں یہ عادتِ ثانیہ ایک سی رہتی ہے اور کسی مخصوص نظم کے موضوع اور متن کے باہمی تعلق سے اگر اس نظم میں شاعر اپنی عادت سے گریز کرتا بھی ہے تو عارضی طور پر ہی وہ اس گریز کو 'برداشت' کرتا ہے۔ کسی بھی نظم کی ایک سطر عروضی ارکان کے انسلاک سے ایک ایسی 'اینٹ' ہے، جو دیگر اینٹوں کی بنیاد در بنیاد بنتے ہوئے نظم کے پورے ڈھانچے کو استوار کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ سطر کی تراش میں تجربہ کاری کی ایک صورت اینٹوں کے ساخت اور سائز کو چھوٹا یا بڑا کرنے سے متعلق ہے اور بیشتر شعرا اپنی جدت پسندی کی وجہ سے ایسا کرتے آئے ہیں۔ (انگریزی میں E.E. Cummings کے علاوہ دیگر کئی شعرا کی مثال دی جا سکتی ہے۔)

مجھے یہ باور کرنے میں کوئی عار نہیں کہ شاعرہ، جو خود پاکستان کے اس شعری منظر نامے کی ناظر ہیں، جس میں غزل (اور غزل میں بھی الٹے، سیدھے، بے ڈھنگے تجربات) کی بہتات نے ان کی طبع رسا پر بھی اثرات چھوڑے ہوں گے۔ ان سے کلیتاً نجات تو شاید ہی کوئی شاعر پا سکتا ہو اور اس شعری مجموعے میں، یہ محسوس کرنا میرے لیے مشکل نہ تھا کہ شاعرہ خود 'نیمے دروں نیمے بروں' کوشاں رہی ہیں کہ اپنے اس تجربے کو کیا حتمی شکل دیں، جس سے وہ غزل کی روایت سے باہر آ کر استعارے اور علامت کے توسط سے وہ بات کہہ سکیں جسے اظہاریہ، بیانیہ یا اعلامیہ کے لبادے میں ملبوس کر کے کہنے کی عادت ثانی ہمارے عہد کے تقریباً سبھی شعرا کو ہے۔

اس سے دو قدم آگے جائیں تو کہا جا سکتا ہے کہ اس مجموعے میں اس بات سے بھی پرہیز کیا گیا ہے کہ دور دراز سے کھینچ کر لائے ہوئے ایسے استعاروں، تشبیہوں، اشاروں سے پرہیز کیا جائے جو اپنی ملفوفیت کی وجہ سے کسی بھی نظم کا حسن سنوارنے کے بجائے اسے بگاڑ دیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ رمز اور استعارے کا برمحل استعمال ہی شعر کو حسن بخشتا ہے لیکن

گنجلک استعارے معنی کے موتی کو ڈِبیا میں، ڈبیا کو ایک صندوق میں اور صندوق کو سمندر کی گہرائی میں ڈبو دینے کا وہ عمل ہے، جو سہل ممتنع کی ضِد ہے۔اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ ثروت صاحبہ نے اس مجموعے کی منظومات میں سہل ممتنع سے کام لیا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ صراحت کی اکہری سطح پر قناعت نہ کرتے ہوئے جہاں جہاں وہ رمز اور علامت کا سہارا لیتی ہیں، خوش سلیقگی سے اسے پھر اپنے اظہار کے انداز اور الفاظ کے استعمال سے صراحت کی طرف موڑ کر لے آتی ہیں۔مفہوم کی ادائیگی براہ راست ہونے کے باوجود قاری تک کوئی پیغام پہنچانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔جو بات اظہر من الشّمس ہے وہ یہ ہے کہ کہیں بھی شعریت سے عاری درشت یا کھردرا لہجہ (جو رواج کے طور پر جدید تر نظم کا شعار بن چکا ہے)، نہیں ہے۔ ثروت صاحبہ نہ صرف نظم کی 'شعریات' سے واقف ہیں بلکہ اس کے لوازمات کو اس خوبی سے استعمال کرتی ہیں کہ عام قاری محظوظ تو ہوتا ہی ہے لیکن باز آفرینی کے طور پر نظم کے مکرر مطالعہ سے ایک آگاہ قاری یہ بھی معلوم کر لیتا ہے کہ شاعرہ نے کس خوبی سے ان لوازمات کو برتا ہے۔

اب آئیں اور ایک ایسے موضوع کو لیں جس سے میں سہواً کنی کتراتا رہا ہوں۔ یہ بات شاعرات کے بارے میں ایک عمومی اور طبعی 'ہال مارک' قرار پا چکی ہے کہ ان کی شاعری میں نسائی لہجے کا دبا ہوا خزینہ کھود کھود کر نکالا جائے، موضوعات میں پدری سماج کے خلاف بغاوت کے عزم و عمل کے جذبات کو پھیلا کر شاعرہ کی شعری دیوار کو کیلی گرافی سے مزین کر دیا جائے ؛ اور اگر یہ عناصر حتمی نہ بھی ہوں تو بھی انہیں اجاگر کر کے دکھایا جائے۔ دیکھیے، میں بھی اس رو میں اب بہنا شروع کرتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ چھان پھٹک کر ثروت صاحبہ کی شاعری میں ان عناصر کو ڈھونڈھ نکالوں، جو اس ذیل میں آتے ہیں۔ مجھے کچھ نظمیں یقیناً ایسی ملیں جن میں عورت کی زبوں حالی کا نقشہ بزبان حال کھینچا گیا ہے اور واحد متکلم میں شاعرہ ''میں'' استعمال نہیں بھی کرتی تو بنت حوا کا تذکرہ ضرور کرتی ہے۔

نظم ''بستر اور باورچی خانے کے درمیان'' کی یہ سطور کچھ زیادہ ہی loud ہیں کیونکہ ان میں راوی کے علاوہ مد مقابل کو ''تم'' کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔

ہزار صدیوں کے سفر کے باوجود

بنتِ حوا کا یہ سفر تو

ازل سے اب بھی

تمہاری خواب گاہ اور

دالان کے درمیان

قید کر دیا گیا ہے۔

''میں تمہارے ہمراہ رقص کرنا چاہتی ہوں'' کو لگارھم کی جیومیٹریکل تشبیہ کے حوالے سے پہلے بیان کیا جا چکا ہوں۔ لیکن یہ سطریں اگر دوبارہ آ جائیں تو بھی کوئی قباحت نہیں ہے،

میں تمہارے ہمراہ رقص کرنا چاہتی ہوں

اور مربع، مثلث اور دایروں کے زاویے

میری آزادی کا مذاق اڑا رہے ہیں

میں سوچتی ہوں

زندگی لگارتھم کا مسئلہ نہیں

جسے کوئی قیمت بتا کر حل کر لیا جائے۔

''ہر عورت کی اک کہانی'' میں لفظ ''ہر'' بمعنی ''ہر ایک'' قابلِ غور ہے کیونکہ اس لفظ کی وساطت سے شاعرہ نے ذات سے نسل تک کا سفر طے کیا ہے۔

کہیں سے مٹی اٹھا کے لائی

خدا بنایا

بدن کی بھٹی میں دل جلایا

ہر ایک خواہش مٹا کے رکھ دی
تمام اطراف اس کی مورت سجا کے رکھ دی

نظر ہواؤں کے نام کر کے
اڑی پھری تھی
لگا تھا ایسے کہ ایک پل کو
سفر کو ہمراہ لے چلی تھی
مگر ہواؤں کا کیا بھروسا
زمیں نہیں آسماں نہیں ہے
صحیفے لفظوں سے ڈر رہے ہیں
یہ پھول پوجا کے مر رہے ہیں
ہمارے ہمراہ لامکانی
ہر ایک عورت کی اک کہانی

تو، صاحبو، یہ مسئلہ بھی بخیر وخوبی طے پا گیا کہ ثروت زہرہ صاحبہ کے ہاں وہ عنصر موجود ہے جسے صنف نازک کی نشاۃ ثانیہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

میں اس حوالے سے گریز پا ہوں کہ ایک اور مسئلے کو، جو ہم سب کا ہے اور ہم سب اس کے بارے میں نظمیں، افسانے اور ناول لکھ رہے ہیں، اپنے اس مختصر دیباچے میں نہ لاؤں۔ یہ مسئلہ برصغیر میں مذہب کے نام پر قتل و غارت کا ہے، دہشت گردی کا ہے اور چہ آنکہ شاعرہ نے اپنی متعدد نظموں میں اسے تشبیہ اور علامت کی مدد سے متشکل کیا ہے، تو بھی اس پر اس قدر زیادہ اظہار رائے ہو چکا ہے کہ میں ان نظموں کے بارے میں کچھ نہیں لکھنا چاہتا۔

واقعاتی، سانحاتی اور رارداتی موضوعات کئی بار اپنی موت خود مر جاتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ہم لوگ جو اس سنہری دھرتی کے باسی ہیں، اس صبر آزما دور سے بھی بہ عافیت نکل جائیں گے۔

میں ثروت زہرہ صاحبہ کو ان کے اس شعری مجموعے پر مبارک باد کا گلدستہ پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند

دیباچہ

میں ثروت زہرہ کی نظموں پر بات کرنے جا رہا ہوں اور مجھے رہ رہ کر اوکلاہوما کی ایک لڑکی یاد آرہی ہے۔ اس لڑکی سے میری ملاقات Villiam Waring Cuney کی کتاب Puzzles میں ہوئی تھی جو نیدر لینڈ سے ۱۹۶۰ میں شائع ہوئی۔ مجھے وہ نظم اچھی لگی تھی اور وہ لڑکی بھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میں دونوں سے محبت کرنے لگا تھا۔ میں نے جھٹ اس نظم کو اُردو میں ڈھال لیا تھا:

"میں ایک لڑکی سے واقف ہوں جو اوکلاہوما کی ہے/جس کا چہرہ بہت دلکش ہے/اور جس کے بدن کی تراش اور قوسیں دل فریب ہیں/وہ بہت ذہین ہے/اور جس کے بنک اکاؤنٹ میں بہت سی دولت ہے/اوکلاہوما کی اس لڑکی کے پاس تین "ز" ہیں/زیور حسن، زیرکی اور زر/اس کے پاس وہ سب کچھ ہے جس کی تمنا دس میں سے نو آدمی کرتے ہیں/ایک لڑکی جسے میں جانتا ہوں اور وہ اوکلاہوما کی ہے/وہ ہر ہفتے (کم از کم) تین گھنٹے/ایک ماہر نفسیات سے مشورہ کرتی ہے/اس لیے کہ وہ اکیلی ہے۔"

(اکلاہوما کی لڑکی)

ثروت زہرہ کی نظموں پر بات کرتے ہوئے Villiam Waring

Cuney کی اس نظم کا یاد آنا اس لیے نہیں ہے کہ جس لڑکی کے اکلاپے کو اس نے اوکلاہوما کی لڑکی میں دکھایا ہے عین مین ویسا ہی ثروت کے ہاں بھی ہے۔ جی بالکل ویسا نہ سہی مگر لگ بھگ ویسا تو ہے کہ ثروت کی نظم کی ہر عورت / لڑکی کا اکلاپا اسی شدت اور تندی سے بولتا ہے مگر وہ مختلف یوں ہے کہ اس کے ہاں ''زیور حسن، زیرکی اور زر'' میں کچھ جمع تفریق ہوگئی ہے۔ بلکہ مجھے کہنا چاہیے، اس باب میں ثروت کے نسائی کردار کچھ اور بڑے اور کڑے آشوب کے مقابل زندگی بھوگتے نظر آتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے جو عورت ثروت کی شاعری کا مسئلہ بنی ہے اس کے پاس زر والی ''ز'' ہے ہی نہیں۔ جس تہذیبی اور سماجی انہدام کی کریہہ ترین صورت حال کو ہم دیکھنے پر مجبور ہیں اس میں جس کے پاس زر نہ ہو وہ رذِل ہو جاتا ہے؛ لغو اور بے ہودہ۔ چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ ایسے میں عورت کا وجود کیسے بامعنی ہوسکتا ہے؟

مجھے یاد ہے میں نے جس زمانے میں نظم ''اوکلا ہوما کی لڑکی'' اُردو میں ترجمہ کی تھی، اُسی زمانے میں آزربائیجان کی ایک شاعرہ نگیار راف بیلی کی'' کچن کے لیے نظمیں'' بھی ترجمہ کر ڈالی تھیں۔ اُس نے اپنی نظموں میں عورت کے حوالے سے زندگی کے ایک مختلف دائرے کو نشان زد کیا اور کہا تھا کہ اگر وہ عورت نہ ہوتی تو اس کا واسطہ تلنی سے، تام چینی کے برتنوں سے اور کفگیروں سے اس طرح نہ پڑتا۔ اُسے صاف تھالیوں، سالن میں نمک کی مناسب مقدار اور ٹماٹر کی چٹنی کی موجودگی کے لیے یوں بے چین نہ ہونا پڑتا اور نہ ہی پونچھتے، بھونتے اور پکاتے ہوئے جلتے چولہے کے پاس پہروں کھڑے رہنا پڑتا۔ یاد رہے کہ نگیار راف بیلی کا شوہر رسول رضا بھی شاعر تھا جس نے سمندر کے حوالے سے کئی نظموں کی ایک شاہکار طویل نظم لکھی تھی۔

کچن کے لیے کئی نظموں پر مشتمل ایک نظم لکھتے ہوئے نگیار راف بیلی نے کہا تھا کہ اگر وہ عورت نہ ہوتی تو وہ بھی پہاڑوں کے بیچ طلوع ہوتے منظروں سے لطف اندوز ہو

سکتی تھی اور سمندری ہواؤں کو اپنے پھیپھڑوں میں بھر کر ساحل پر گھنٹوں ان کہی مسرت کے بیچ ٹھہرتی اور اس لطف کے حوالے سے نظمیں لکھ سکتی تھی مگر یوں ہے کہ اس کی زندگی کا دائرہ مختلف ہے۔

ثروت زہرہ کے ہاں بھی زندگی کا دائرہ مختلف ہو گیا۔

"یہ جھاڑن کی مٹی سے / میں گر رہی ہوں / یہ پنکھے کی گھوں گھوں میں، / میں گھومتی
ہوں / یہ سالن کی خوش بو پہ / میں جھومتی ہوں / میں بیلن سے چکلے پہ / بیلی گئی
ہوں / توے پر پڑی ہوں / ابھی جل رہی ہوں / یہ ککر کی سیٹی میں / میں چیختی ہوں / کسی
دیگچی میں پڑی گل رہی ہوں / مگر جی رہی ہوں"

(بے پروں کی تتلی)

یہ ہے عورت کے قلب اور اس کی فطرت کو منکشف کرنے والی زبان اور لہجہ، اور یہ ہے وہ اوکلا ہوما والی لڑکی جیسی ذہانت جو بولتی ہے، اور یہ ہے وہ ایک اور طرح اکلاپا، تیز خنجر کا سا، جو عورت کا کومل وجود کاٹتا ہے یوں کہ ماس کٹنے اور ہڈیاں ٹوٹنے کی آواز سارے میں گونجتی ہے، اور یہی ہے وہ زندگی کا مختلف دائرہ جس میں عورت مقید ہو کر رہ گئی ہے۔ جھاڑن سے جھڑنے والی، پنکھے کی گھوں گھوں میں گھومنے والی، سالن کی خوش بو پر جھومنے والی، گندھے آٹے کی طرح پیڑا ہو کر بیلے جانے والی۔ جلتے توے پر جل جانے والی یہ عورت ککر کی سیٹی میں چیختی ہے مگر اپنے ہی وجود کے اندر گلتے رہنا اور ایک خاص دائرے میں مر مر کر جیے چلے جانا اس عورت کا شناخت نامہ ہے۔

بستر اور باورچی خانے کے درمیان سعی کرتی اس عورت کو جس شاعرانہ صداقت کے ساتھ ثروت نے اپنی نظموں میں نشان زد کیا ہے اس سے جدید تر حسیت کے ساتھ ساتھ صدیوں کے غلط نہج پر سدھائے ہوئے انسانی رویے بھی پوری طرح

ننگے ہو کر سامنے آ جاتے ہیں ۔ اس باب میں شاعرہ کی حسوں پر نہ تو ماضی کی بوسیدہ مہک سحر کرتی ہے نہ اس کی آنکھوں کو نئے زمانے کی چکا چک چندھیاتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ ہزار صدیوں کے سفر کے باوجود اگر کہیں بنتِ حوا کا یہ سفر ازل سے ایک دائرے کا سفر ہے؛ خواب گاہ سے دالان کے درمیان والا، چوکھٹ سے نکل کر چادر میں لپٹ جانے والا، تو کہیں اُسے ایسی ورکنگ لیڈی بنا دیا گیا ہے جس کی گردن کے گرد ایک اور دائرے کا پھندا بڑھالیا جاتا ہے۔ ''مردانہ وار'' آگے بڑھنے والے اس عورت سے نسائی جذبے چھینے جا رہے ہیں۔ اس کے بخت میں نہ چوڑی کی کھن کھن ہے نہ پائل کی چھن چھن ۔ نہ گجرا، نہ مہندی۔ یہ نہ آنکھ میں سرمہ ڈالتی ہے، نہ اسے اُبٹن لگانے کا ہوش ہے کہ یہ تو اپنا آپ بھولے بیٹھی ہے ۔ بس اسٹاپ پر کھڑی عورت، بہت سے مردوں کے بیچ مگر اپنے مرد سے کٹ کر کھڑی یہ عورت بھی ثروت کی شاعری میں آئیڈیل عورت نہیں ہو پاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایسے میں پھر وہ ڈیوڑھی سے نکلتے ہوئے بچوں کی چیخیں سنتی ہے، پلٹ کر جلتے چولہے کو دیکھتی ہے اور خود کو میلے کپڑوں کے ڈھیر میں تلاش کرنے لگتی ہے۔

> نیا زمانہ آ گیا ہے ۔ اس نئے زمانے میں وہ روایتی عورت خاتون خانہ ہو کر اپنی اولاد کے لیے دودھ کی ایک بوتل، اپنے صاحب کے لیے تسکین کا سامان، گھر کے لیے مشین اور اپنے لیے بس ایک آہٹ بن کر رہ گئی تھی، نئی عورت کی جون میں ڈھل رہی ہے ۔ اس نئی عورت کا المیہ یہ ہے کہ اس سے وہ گھر چھن رہا ہے جو ہزار عذابوں کے ساتھ سہی، اس کے لیے پناہ گاہ تھا۔ یہ گھر ایسی کائنات ہو سکتا تھا جس کے مرکز میں وہ خود ہوتی ؛ ماں، بیوی، بیٹی، بہن بن کر ۔ اور جہاں اس کے امکانات بہر حال موجود تھے کہ یہ رشتے خلوص اور ایثار کی بنیاد پر قائم ہوں تو گھر

جنت ہو جائے۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں عورت کو وہ تکریم نہیں
دی جاتی، وہاں یہی گھر اور یہی رشتے قید اور پھندا ہو جاتے رہے ہیں۔
ایسے میں نئی عورت نے زندگی کے جس نئے دائرے کو اپنی اوپر واجب کیا
ہے اس میں دفتر کی مشقت ہے، چبھتی ہوئی نگاہیں ہیں، کی بورڈ کی ٹک
ٹک ہے اور شام کے ڈھلتے ہوئے سایوں میں واپسی کا سفر ہے جو ایک
نئے امتحان کا آغاز ہو جاتا ہے:۔

''جلی شام! پر سرمئی رُت کدھر ہے/ تھکی ماندی آنکھوں میں لمبا سفر
ہے/ یہ دہلیز، آنگن مگر سکھ کدھر ہے/ ادھورے کئی کام رکھے ہیں، گھر
ہے/ ہر اک سانس اب وقت کی دھار پر ہے/ وہ آسودہ لمحے کہاں چھوڑ
آئی/ میں خود کو نہ جانے کہاں بھول آئی! / تھکن بستروں پر پڑی اونگھتی
ہے/ نگاہوں کی گرمی تلک سوچکی ہے/ ہر اک پل ہمیں اگلے دن کی پڑی
ہے/ مجھے یہ تسلی کہ خود جی سکوں گی/ تمھیں یہ سہارا کہ ثروت بہت ہے
وہ فرصت کے دن میں کہاں چھوڑ آئی/ میں خود کو نہ جانے کہا بھول آئی''

(ورکنگ لیڈی)

ثروت نے محض عورت کو مرکز نگاہ نہیں بنایا پوری کائنات پر اس کی نظر
ہے۔ اس کائنات کے مرکز میں وہ انسان کو دیکھنا چاہتی ہے مگر انسانوں کے بیچ
تعلق کی نئی ترتیب پر اس کی نظر پڑتی ہے تو انسان اور انسانیت کا سارا سفر سوگ کا
منظر نامہ ہو جاتا ہے:

''کراہت کی منڈی میں/ سرسبز شاخوں، گل لالہ چہروں
کے / بازار لگنے لگے ہیں/ ز میں اپنے دریا کنارے
پڑی/ ادھ موئی پیاس کی پپڑیاں پالتی ہے/ زندگی! تیرے

خوانچہ فروشوں کو/زخموں کے اس تول میں دام وافر ملا
ہے/نصیبے کے ہر زائچے میں/نیو ورلڈ آرڈر کی لو/سایہ کرتی
رہی ہے/سڑک پر جمے خون کے داغ دھبے/مرے راہ
گیروں کا زادِ سفر ہیں/بڑے چوک پر/قصہ خوانوں کی آواز
میں/ کل کی خبروں کی دہشت گھلی ہے/ کباڑی کے ٹین
اور ٹکڑوں تلے /ادھ کھلی انگلیوں میں گریبان /اور آدھی
سگریٹ کا ٹوٹا دبا ہے/بھکارن کے کاسے میں/خاموشیوں
سے بلکتے ہوئے /باسی سکے دھرے ہیں / کڑکتی کڑاہی
میں/اگلے دنوں کی بشارت تلی جا رہی ہے/رواں نالیوں
میں/جواں ،شبنمی ،نازنیں، خواب آلود آنکھیں/بہی جا رہی
ہیں / گلی کے کنارے /جواں آوارہ آوازے اور
سیٹیاں/ بھسم ہونے لگے ہیں/زمانے کے بازار میں آج
پھر/سوگ کی بولیاں چڑھ رہی ہیں''

(سفر میں سوگ کا منظر)

اوبڑ کھابڑ راہوں پر پڑی انگڑ کھنگڑ سی زندگی جھیلنے والا آدمی ہو یا لش لش کرتی شاہراہوں پر شاندار زندگی سے لطف اندوز ہونے والا اور منڈی کی معیشت کا حصے دار آدمی، دونوں انسان کہلانے کے لائق نہیں ہے۔ثروت نے انسان کے ہر رخ کو مقامی سطح پر دیکھا ہے اور عالمی سطح پر بھی ۔اور جہاں جہاں اسے ناہموار زندگی نظر آئی ہے وہاں وہاں اس نے چوٹ لگائی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ثروت نے محض عورت کو مرکز نگاہ نہیں بنایا پوری کائنات پر اس کی نظر ہے۔ تاہم اس کائنات کے حاشیے پر نہیں بلکہ عین مرکز میں وہ انسان کو دیکھنا چاہتی ہے۔ بنیادی طور پر یہ انسان

اور اس کی انسانیت عورت اور مرد کے باہمی متوازن اور پرخلوص تعلق سے ہی عبارت ہیں ۔جس طرح ثروت کی کائنات اپنے وجود سے جڑی ہوئی ہے اسی طرح وہ زمین اور اس کی خوشبو سے بھی وابستہ ہے۔ یہ زمین اور اس کی مہک اس کے لیے ماں اور ماں کی محبت بھری گود جیسی ہے۔ وہ اس سے ہمکلام ہوسکتی ہے؛ اس سے اور اس پر بہتے سندھو سے ۔سندھو جو ازل سے زندگی اور اس کے تسلسل کی علامت رہا مگر جسے اب اندیشوں کی ریگ مسلسل ایک ڈیک پئے چلی جاتی ہے ۔

''بوند بوند مٹی سے جنمے/سندھو دریا پچھتاؤ گے/رُت کی کوکھ میں آہوں کا جب بیج بڑھے گا/سرد ہوا تک آنکھ چرا کر گزرے گی/لوری کی ہوگلی گلی میں بکھرے گی/دن کے شانوں چڑھ کر بھوک...../ہمارے گھر آئے گی/شام جنازے ڈھوتے ڈھوتے تھک جائے گی/شب بوجھل ویرانی اوڑھے/چیخے گی ، چلائے گی/ دور فلک سے روپ کی گٹھری/ کھول کھول کے اترے بادل/ کاجل بن کر بہہ پاؤ گے؟/ بجھتے چولھے ، گیلی لکڑی/ کشکولوں کو بھر پاؤ گے؟/سندھو دریا پچھتاؤ گے''

(سندھو دریا پچھتاؤ گے)

ثروت اپنی نظموں میں نہ صرف نئی نئی تمثالیں بناتی ہے ، الگ سا لہجہ تراشتی ہے اور زبان مختلف کردیتی ہے وہ سطر سازی کی دھن میں ایک تخلیقی عجب کا اہتمام بھی کیے چلی جاتی ہے۔ اس باب کی چند مثالیں محض ایک نظم ''عمر رسیدہ خواب'' سے دیکھیے ۔ یہاں خواب سے خواب پیدا ہورہے ہیں۔خوابوں کے پتھر چمک رہے ہیں۔خواب آنکھوں میں چبھتے ہیں ۔آنکھیں ملنے سے خون ابلتا ہے اور تماشا پگھلتا ہے۔ اسی نظم میں دن کبیدہ ہوکر بے حجابی تمنا کو اوڑھ لیتے ہیں ۔ یہاں خوف کے زاویے سرکشیدہ ہوتے ہیں۔ اور مٹھیوں میں چھپا آسرا ریت سا ہوکر گرنے لگتا ہے۔عمر رسیدہ خواب نظم میں دل کا دیمک زدہ شہر جھڑنے لگتا ہے۔ اسی طرح ہر نظم میں اس نے ایسے تخلیقی

قرینے رکھے جو اس کے نظم کہنے کے قرینے کو مختلف کر دیتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ثروت ان معدودے چند شاعرات سے ہے جو اپنے تخلیقی تجربے کی سچائی سے جڑی ہوئی ہیں۔ موضوع اور مسئلہ کوئی بھی ہو وہ اُتھلی نہیں ہوتی۔ توجہ حاصل کرنے کے لیے لذت کے چھینٹے نہیں اڑاتی۔ موضوع کا رعب ڈالنے کے لیے اجنبی لفظیات کا سہارا لے کر ترسیل میں رخنے نہیں ڈالتی۔ وہ نظم کہتے ہوئے ہر بار اپنے وجود کی سچائی اور تخلیقیت سے جڑ جاتی ہے۔ نظم کہنے کا یہ قرینہ اُسے باتمکین بنا دیتا ہے اور اس کے لفظ کو معنویت سے بھر کر اسے تیکھا اور چمک دار؛ بالکل اس طرح، کہ جیسے انگور کا دانہ رس سے پوری طرح بھر جائے تو اس کی جلد تن کر ایک چمک اچھال دیا کرتی ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ ''جلتی ہوا کا گیت'' کی طرح یہ نئی کتاب بھی اپنے متنوع موضوعات، شعری جمالیات اور اسلوب کے نئے پن کے سبب بہت مقبول ہوگی۔

محمد حمید شاہد

اسلام آباد

۱۵ر جولائی ۲۰۱۳ء

تماشا گاہِ دنیا میں

اُڑیں
مہکی ہوئی زلفیں
جھکیں بے باک سی نظریں
بہکنے کو چلیں سانسیں
الجھنے کو کہیں بانہیں
مگر

دل میں دبے یہ کاغذی جذبے
ضرورت سے بندھے بے نام دھوکے ہیں
نہ صبحیں سورجوں کے رنگ پہنے ہیں
نہ راتوں کے لیے چندا کے گہنے ہیں

نگاہوں نے گھڑی کی ٹکٹکی پر
بے محابہ رنگ کے انبار دیکھے ہیں
ہزاروں طرز کے بے ذائقہ ادوار چکھے ہیں
تماشا گاہِ دنیا میں
نہ تم، تم ہو
نہ میں ، میں ہوں
فقط مقروض بوسے ،
آنکھ کے زخمی پپوٹے ہیں
نئے ادوار کے انساں
دکھانے کو تو قد آور
مگر اندر سے چھوٹے ہیں

ہست کا دسترخوان

ہست کے دسترخوان پر
درد کے پیالوں میں ضبط چن دیا گیا ہے
کھا لیجیے!
خواب کی ریوڑیاں
چباتے ہوئے زبان
کٹ گئی ہے
ذائقہ لیجیے!

وجود کی کھال میں
لمس کا بھس بھر دیا گیا ہے

بچا لیجیے !

درز کے پھٹے دودھ کی روشنی

آسمان سے صحن تک

بچھا دی گئی ہے

پتلیوں میں چھپا لیجئے !

خوف مرتبان توڑ کر

خیال میں زہر گھولتا ہے

منظروں کو بچا لیجئے !

عمر رسیدہ خواب

دفعتاً

خواب سے خواب پیدا ہوئے

ربط سے ربط ایسے ملے

بند شیشوں کے اس پار منظر بدلنے لگا

دل سنبھلنے لگا

دفعتاً،

'آنکھ میں کچھ ہیولے، ہویدا ہوئے

کنکروں کی طرح خواب چبھنے لگے

آنکھ ملنے لگی

خوں اگلنے لگی
منظروں کا تماشا پگھلنے لگا
دفعتاً
دن کبیدہ ہوئے
بے حجابی تمنا کو اوڑھے ہوئے
شب بھگونے لگی
شوق جلنے لگا
دفعتاً
خوف کے زاویے سرکشیدہ ہوئے
مٹھیوں میں چھپا آسرا
ریت سا ہو کے گرنے لگا
دل کا دیمک زدہ شہر جھڑنے لگا

بستر اور باورچی خانے کے درمیان

ہزار صدیوں کے سفر کے باوجود
بنتِ حوّا کا یہ سفر تو
ازل سے اب تک
تمہاری خواب گاہ اور
دالان کے درمیان
قید کر دیا گیا ہے

نہ جانے کتنے قدم ہیں
جوتمہارے بستر میں
حنوط ہو کر پڑے ہوئے ہیں
کتنی منزلیں ہیں
جوتمھارنے بستر سے
باورچی خانے کے درمیان دفن ہوچکی ہیں!

ورکنگ مدر

امی ۔۔۔۔۔ی ی ی !!!

آفس جانا ہوتا ہے؟

آفس چوں (کیوں) جانا ہوتا ہے؟

امی! واپس آؤ گی (کب) ؟

امی !میں کیسے سوؤں گی

امی! ماسی گنی (گندی) ہیں

میں کیسے کھانا کھاؤں گی؟

فون پہ مجھ سے بات کرو گی؟

اتیار (اتوار) کوتو گھر میں رہو گی ؟

روز مری دہلیز پہ ٹھہری
میری منیا کی وہ آنکھیں
رخساروں تک کی برساتیں
ننھے ہونٹ پہ جلتی باتیں
میرے قدموں کے نیچے سے
شہر کا رستہ کھینچ رہی ہیں!

سفر میں سوگ کا منظر

کراہت کی منڈی میں
سر سبز شاخوں، گل لالہ چہروں کے
بازار لگنے لگے ہیں
زمیں اپنے دریا کنارے پڑی
ادھ موئی پیاس کی پپڑیاں پالتی ہے
زندگی! تیرے خوانچہ فروشوں کو
زخموں کے اس تول میں دام وافر ملا ہے

نصیبے کے ہر زائچے میں
نیو ورڈ آرڈر کی لو
سایہ کرتی رہی ہے
سڑک پر جمے خون کے داغ دھبے
مرے راہ گیروں کا زادِ سفر ہیں
بڑے چوک پر
قصہ خوانوں کی آواز میں
کل کی خبروں کی دہشت گھلی ہے
کباڑی کے ٹین اور ٹکڑوں تلے
ادھ کھلی انگلیوں میں گریبان
اور آدھی سگریٹ کا ٹوٹا دبا ہے
بھکارن کے کاسے میں
خاموشیوں سے بلکتے ہوئے
باسی سکے دھرے ہیں
کڑکتی کڑاہی میں
اگلے دنوں کی بشارت تلی جا رہی ہے

رواں نالیوں میں

جواں ۔۔

شبنمی ۔۔

نازنیں۔

خواب آلودہ آنکھیں

بہی جا رہی ہیں

گلی کے کنارے

جواں ۔آوارہ   آوازے اور سیٹیاں

بھسم ہونے لگے ہیں

زمانے کے بازار میں آج پھر

سوگ کی بولیاں چڑھ رہی ہیں

جنھیں آسماں کھا گیا

ہر آہٹ پر
یوں لگتا ہے
وہ آیا ہے
ہانڈی میں بھجیا تو کم ہے
لیکن
سورج کے گھٹنے بڑھنے کی
اس لک چھپ میں
آنگن میں کس کا سایہ ہے

آئینے میں

کون اپنی چھب دکھلاتا ہے

چپکے چپکے کون آتا ہے

آنکھوں کے جلتے دیپک میں

جلتی بجھتی کیا مایا ہے

روح اور جسم کی ٹھنڈی مٹی

چپ سے لیپی تیری اٹّی

میں ہی جانوں.....

چوکھٹ سے چادر کے کونے تک

سارے منظر آس سمیٹے

گنگ کھڑے ہیں

بچے بالے

میری آس کے سنگ کھڑے ہیں

رنگوں رنگی باسی چنری میں
امیدوں کے سوسو عریاں
رنگ جڑے ہیں
گم ہونے والے کے ہر سو
رنگ پڑے ہیں
ہاں سے نہیں تک
دھرتی کے بازار اور کوچے
دنگ کھڑے ہیں

ورکنگ لیڈی

نہ چوڑی کی کھن کھن، نہ پائل کی چھن چھن
نہ گجرا ،نہ مہندی، نہ سرمہ، نہ ابٹن
میں خود کو نہ جانے کہاں بھول آئی

جو ڈیوڑھی سے نکلی تو بچے کی چیخیں
وہ چولھا، وہ کپڑے، وہ برتن، وہ فیڈر
وہ ماسی کی دیری، وہ جلدی میں بڑ بڑ
نہ دیکھا تھا خود کو، نہ تم کو سنا تھا
بس اسٹاپ پر اب کھڑی سوچتی ہوں

کسے سینت رکھا کسے چھوڑ آئی
میں خود کو نہ جانے کہاں بھول آئی

وہ چبھتی نگاہیں، وہ آفس کی دیری
سیاہی کے دھبوں میں رنگی ہتھیلی
وہ باتوں کی ہیبت جو سانسوں نے جھیلی
وہ زہری رویے، وہ الجھی پہیلی
مری مٹھیوں میں سلگتی دوپہری
میں کی بورڈ پر انگلیاں چھوڑ آئی
میں خود کو نہ جانے کہاں بھول آئی!

جلی شام! پر سرمئی رُت کدھر ہے
تھکی ماندی آنکھوں میں لمبا سفر ہے
یہ دہلیز ، آنگن مگر سکھ کدھر ہے
ادھورے کئی کام رکھے ہیں، گھر ہے
ہر اک سانس اب وقت کی دھار پر ہے
وہ آسودہ لمحے کہاں چھوڑ آئی
میں خودکو نہ جانے کہاں بھول آئی!

تھکن بستروں پر پڑی اونگھتی ہے
نگاہوں کی گرمی تلک سوچکی ہے
ہر اک پل ہمیں اگلے دن کی پڑی ہے
مجھے یہ تسلی کہ خود جی سکوں گی
تمھیں یہ سہارا کہ ثروت بہت ہے
وہ فرصت کے دن میں کہاں چھوڑ آئی
میں خود کو نہ جانے کہاں بھول لائی

''علینہ'' کے لیے

یہ ''علینہ''

علی کی نئے آسمانوں کی جانب

نئی جست ہے

زندگی کی طرف

خواب اور اس کی تعبیر کا

رقصِ سرمست ہے

اس طرح کہ

عدم آئینہ میں کھڑی

ہانپتی روشنی !لفظ کی تیز رفتار پر آپ حیران ہے

یہ "علینہ"

زمین و زماں، آسماں، لامکاں
کی حدوں سے پرے پھیلتے فاصلوں کی حکایت نہیں
آدمی کی شکایت نہیں
آسماں کی کہانی نہیں
آسماں کی کہانی میں خود آسماں ہے
انوکھا جہاں ہے

یہ اس آدمی کا جہاں ہے
سبھی جس طرف اپنی خواہش کی ناؤ میں بہتے رہے
درد (پہلی جدائی کا) سہتے رہے
اور کہتے رہے
زندگی دن کی کشتی میں سوئی ہوئی
گم شدہ رات ہے

یہ "علینہ"
علی کی نگاہوں کے صحراؤں میں
نور کے آبگیں کھیل کی

ان کہی بات ہے
زندگی پہلے موسم کی برسات ہے

زندگی لگارتھم کا مسئلہ نہیں

میں تمھارے ہمراہ رقص کرنا چاہتی ہوں
اور مربع ، مثلث اور دائروں کے زاویے
میری آزادی کا مذاق اڑا رہے ہیں
میں سوچتی ہوں
زندگی لگارتھم کا مسئلہ نہیں
جسے کوئی قیمت بتا کر حل کر لیا جائے
ابھی آسمان سے ایک تارے نے
چھلانگ لگائی تو لگا
مستطیل کا کونا ٹوٹ گیا

یکا یک ہوا کی ناؤ پر بیٹھی رات

اپنی غلط فہمی پر ہنسنے لگی

ٹوٹا ہوا تارا آئینے میں

روشنی کی لکیر کھینچ کر

خود میں پلٹنے لگا

تو منجمد عکس اسے دبوچ کر نا چنے لگے

ابھی میں نے تمھاری محبت کی تکون سے

قدم باہر رکھے ہی تھے

کہ خوابوں کا ریشم

میرے پاؤں سے الجھ کر

مجھے خود میں لپیٹنے لگا

تو چلو! میرا ہاتھ تھام کر

مجھے اپنے دائرے سے باہر نکالو

میں پھر سے الاؤ میں

تمھارے ہمراہ رقص کرنا چاہتی ہوں

سندھو دریا پچھتاؤ گے

بوند بوند مٹی سے جنمے
سندھو دریا پچھتاؤ گے
رُت کی کوکھ میں آہوں کا جب بیج بڑھے گا
سرد ہوا تک آنکھ چرا کر گزرے گی
لوری کی ہو۔۔
گلی گلی میں بکھرے گی
دن کے شانوں چڑھ کر بھوک.....
ہمارے گھر آئے گی
شام جنازے ڈھوتے ڈھوتے تھک جائے گی

شب بوجھل ویرانی اوڑھے
چیخے گی ، چلائے گی
دور فلک سے روپ کی گٹھری
کھول کھول کے اترے بادل
کاجل بن کر بہہ پاؤ گے؟
بجھتے چولھے ، گیلی لکڑی
کشکولوں کو بھر پاؤ گے؟
سندھو دریا پچھتاؤ گے

عریضے کی ڈالی

تری نرم لہروں پہ رکھے دیے
اپنی باتی کے ہمراہ گم ہو چکے ہیں
دعاؤں، تمناؤں، خوابوں کا موسم
اذیت کے کیچڑ میں لتھڑا پڑا ہے
خطوں کے لفافے
حروف و معنی کے رنگوں سے
خالی پڑے ہیں
کناروں سے ڈالی گئی

رخت کی سرخ روسازشی پتیاں
راستوں کے نشان کھو چکی ہیں
مگر.....
اگلے دن کے حسیں خواب.....
عریضے کی ڈالی
ابھی تک کہیں کانپتی ہے

میں زندہ ہوں

(بے نظیر کی نذر)

میں خون نہا کر نکلوں گی
میں درد سجا کر نکلوں گی
تم جب جب بھوک اگاؤ گے
میں دھرتی چیر کے نکلوں گی
تم خواب کو قتل کیے جاؤ
میں تعبیروں میں بولوں گی۔

تم رُت میں زہر ملاتے ہو
میں تریاقوں میں ڈولوں گی
ہر خواب کے دل میں دھڑکوں گی
ہر خون میں گرمی گھولوں گی

ہر روزن سے ہر رستے سے
میں نور کی صورت نکلوں گی
ہر روز شفق کی سرخی میں
ہر سو آنگن میں پھیلوں گی
تم جسم کو گولی مارو گے
میں روح کی صورت ابھروں گی
تم جتنے نقش مٹاؤ گے
میں اتنے نین پہن لوں گی

Female Gaze

دین زمانہ خان کی نسلیں !
اس 'ناپاک' کی کوکھ سے نکلیں
لیکن یہ مردود بلائیں
اُجلے دن کی لو نہ پائیں
دین زمانہ خان کے چوٹے!
ان کی سانس کی پھکنی پھونکے
لیکن یہ ست رنگ پتنگیں
اپنی ہوا میں ڈول نہ پائیں

دین زمانہ خان کے بستر!
ان کی آہٹ اوڑھ کے پگھلیں
لیکن ان کے سندر سپنے
گہری نیند سے جاگ نہ پائیں
دین زمانہ خان کے صحن میں!
یہ گل بوٹے کاڑھتی جائیں
لیکن ان کے خوف کی چیخیں
قبر بدن میں گھٹتی جائیں

دین زمانہ خان!
خدا کے حکم سے، اپنا حکم چلائیں
فصلیں کاٹیں، جشن منائیں
دودھ کی نہریں پیتے جائیں
لیکن ان کی جیون تانیں
لمحہ لمحہ گھٹتی جائیں

دین زمانہ خان کی پگڑی کلف لگائیں
ان کے بوٹ کے تسمیں باندھیں
اور ازار بندوں کو گوندھیں
لیکن ان کے اپنے دن تو
کالی رُت کی چادر اوڑھے
رات سمے میں ڈھلتے جائیں

پیا گھر آئے تھے!

جڑوں تک ہرے یہ تناور زمانے
تمھارے سہارے بڑھے جارہے تھے
یہ بیلیں، یہ بوٹے، یہ پکی منڈیریں
تمھاری جوانی چڑھے جارہے تھے
یہ بالون کے گجرے یہ سرسبز ڈالیں
تمہارے یقیں پر کھلے جارہے تھے

وہ لوری کے موسم وہ خوابوں کے گہنے
کسی بھیگی رت میں ڈھلے جارہے تھے
اترتے ہوئے دودھ کے ذائقے تک
مرے دل کو رس سے بھرے جارہے تھے

تم آئے تو اس بار رت کے بہانے
یہ کیا کہ تمہی نے مٹائے زمانے
تناور تناور کھڑے سب ٹھکانے
مہکتی نگاہوں کی عریاں اڑانیں
منڈیروں کی باتی، گلابوں کی تانیں
تم ہی لوٹ کر لے گئے سب ترانے!

صلیبِ زیاں سے

میں صلیب زیاں پر لٹکتی رہوں
کیلیں دھنستی رہیں، خون رستا رہے
ایک انبوہ ہے، بے کراں بدزباں
ایک سچ جو سبھی پر ہے کوہِ گراں
میں تماشا رہوں، شور بڑھتا رہے

گالیاں سیٹیاں، چند خاموشیاں
دوہرے معیار کے فیصلوں کی دکاں
چپ کی تدبیر میں دل سنبھلتا رہے
کیلیں دھنستی رہیں، خون رستا رہے

جھوٹ اور خوف کی آنکھ عادی نہیں

کوئی مجرم نہیں، میں فسادی نہیں

تیر و دشنام کا وار چلتا رہے

کیلیں دھنستی رہیں، خون رستا رہے

الفاظ کا گردباد

کھل گئی پھر زباں
فاسد و بد گماں
پھر سے لفظوں کے ٹانکے ادھڑنے لگے
پھر سے سارے تقدس بکھرنے لگے
کھل گئی پھر زباں
فاسد و بد گماں

وہ خیالات کہ دل بلکنے لگے
کاش تو اے زمیں مجھ پہ پھٹنے لگے

کیسا سود و زیاں
کھل گئی پھر زباں

اتنی تلخی کہ چہرہ بگڑنے لگے
اس قدر زہر کہ کان جلنے لگے
ہے کوئی آشیاں
کھل گئی پھر زباں

لفظ کیا ہیں کہ آتش فشاں ہیں کوئی
نفرتیں، تلخیاں، گالیاں ہیں کوئی
ہے کہیں سائباں؟
کھل گئی پھر زباں

$E = mc^2$

میں اپنے وجود کی غلام گردشوں کی قید سے
نکلنا چاہتی ہوں
اے مری زمین !
تجھے دائروی کائنات کے جال میں
نہیں آنا چاہیے تھا
کیوں کہ
میں کسی بھی پرکار کے مرکزوں ورقوسین کی
تحویل میں نہیں جانا چاہتی
خیر!!
میں جانتی ہوں

اے مری ناف سے بندھے عصبی جال !

ترے تناؤ سے

مرے وجود کا ریشہ ریشہ

نظام شمسی سے بندھا ہوا ہے

مرا پور پور تک سنا ہوا ہے

کبھی مرے سیماب صفت لہو نے

وقت کے جبر میں

پیغام کی ترسیل سیکھ لی تھی

وہ پرانا پیغام !!

جو روشنی کی آنکھ سے ہوتا ہوا

مرے دل تک اتر گیا ہے

ہر ایک پل پر کھدا ہوا ہے

یہ مرا دل !

دائری نظام کا سب سے پرانا قیدی

جو اپنی زُہرائی مگس گیر (Venus trap) پتوں سے

روز کھو دے جانے والی

سرنگ کھا رہا ہے

مگر کوئی زحل
اب بھی برف سی ٹھنڈی
مری بانجھ زمین میں
نئے سینچروں کی کاشت کرنا چاہتا ہے
مگر حاکمِ سخت مرا شعور
ہفت آسمان اوڑھے
مرے آتشیں دیوتا کو
قید کئے جا رہا ہے
ابھی بھی سوال کے ہتھیار لئے مریخ
حسن کی دیوی وینس کی رہائی کے لئے
نئے یدھ کی تیاریاں کر رہا ہے
مگر ساغر دیوتاؤں سی پھیلی یکسانیت
مجھے اپنے گرداب میں لے چکی ہے
لیکن پھر....
ہاں اب بھی میں....
اپنے وجود کی غلام گردشوں سے نکلنا چاہتی ہوں

آمریت کا قصیدہ

بھاری بوٹوں تلے روندتے جایئے
کونپلوں کے بدن آہٹوں کے دیے
بھاری بوٹوں تلے روندتے جایئے

ریسماں باندھ کر خواب بنتے رہے
حبس کی تال پر سانس چلتے رہے
چاہیے آپ کو اور کیا چاہیے
بھاری بوٹوں تلے روندتے جایئے

شام لو کو لیے رات سہنے گئی
درد کی اوڑھنی خاک پہنے گئی
ڈھانپئے شوق سے ہر کرن ڈھانپئے
بھاری بوٹوں تلے روندتے جایئے

بھوک مصلوب جسموں کو کرنے لگی
زخم بہنے لگے آس مرنے لگی
آپ کو کیا غرض ہم مرے یا جیے
بھاری بوٹوں تلے روندتے جایئے

صِرف خانے بدلنے سے کیا فائدہ
چند نامے بدلنے سے کیا فائدہ
ہم پیادہ سفر تھے پیادے رہے
بھاری بوٹوں تلے روندتے جائے

زندگی ٹریفک بلاک

زوں...زوں...زٹاک!

دھڑ...دھڑ...دھڑ....دھڑام!!

تصادم.........

سڑک پہ بکھری ہوئی چیخیں

شریانوں میں راستہ بناتی

ایمبولینس کی ہوکتی سیٹیاں....

تماشائیوں کے ہجوم میں پھنسی....

خون میں تر بتر.....

انسانی لاشیں....

برق رفتار گاڑیاں سانس روکے ہوئے....

ایف۔ایم ریڈیو پر...

فلمی نغموں کی بڑھتی ہوئی آواز...

ایکسیلیٹر پہ جمے ستاتے پیر....

تھکن سے لبریز....

اردگرد سے بیزار چہرے....

''یہ تو برا ہوا...''

امنڈتی ہوئیں چہ مہ گوئیاں

''پتا نہیں کتنی دیر تک پھنسے رہیں گے''

''یہاں تو یہ روز کا معمول ہے''

نیند سے بوجھل آنکھیں....

چہار سمت گاڑیوں کا سیلاب....

نئے ماڈلوں کے انجنوں کا پیچ و تاب....

نہ آگے جانے کا راستہ

نہ پیچھے جانے کی کوئی امید

زندگی ٹریفک بلاک.......

بے پروں کی تتلی

یہ جھاڑن کی مٹی سے
میں گر رہی ہوں
یہ پنکھے کی گھوں گھوں میں
میں گھومتی ہوں
یہ سالن کی خوش بو پہ
میں جھومتی ہوں

میں بیلن سے چکلے پہ
بیلی گئی ہوں

توے پر پڑی ہوں
ابھی جل رہی ہوں
یہ ککر کی سیٹی میں
میں چیختی ہوں
کسی دیگچی میں پڑی گل رہی ہوں
مگر جی رہی ہوں

وقت بھی مرہم نہیں

مجھے سانپ سیڑھی کے
اس کھیل سے
آج گھن آ رہی ہے
مرے دل کے پانسے پہ کھودے گئے
یہ عدد
مجھ کو محدود کرنے لگے ہیں
بساطِ زیاں پر
مرے خواب کا ریشمی اژدھا
چال کے پیرہن کو نگلنے لگا ہے

مری جست کی سیڑھیاں
سوختہ ہڈیوں کی طرح
بھربھری ہو کے
جھڑنے لگی ہیں
کھیل ہی کھیل میں
سبز چوکور خانے
کسی قبر کی چار دیوار بن کر
مرا دم نگلنے لگے ہیں
سو،
اے وقت!
میرے مقابل کھلاڑی!!
آج سے
تو بھی آزاد ہے
میں بھی آزاد ہوں

دُعا

خدائے لوح و قلم !
مجھے تو، وہ شوق دے دے
جو حرف لکھوں
وہ نعت ٹھہرے
ادائے صبحِ کرم !
مجھے تو، وہ خاک کر دے
جو اُن کی گلیوں میں
ایسے بکھرے
کہ روز ۔۔۔
سبز جالیوں کو چومے

صدائے شامِ عدم !

مجھے تو، وہ حرف دے دے

جو ان کی سیرت سے ایسے مہکے

دل ونظر کے حجاب دھو دے

دعائے خاک ارم !

مجھے وہ، گدائی دے دے

جو ان کی درگاہ میں

کاسۂ روح رکھے

اور ان سے

ساعت افتخار لے لے

ہوائے طیبۂ نم !

مجھے تو، وہ درد دے دے

جو اُن کی نسبت لہو میں پھیلے

نظر سے ٹپکے

تلاشِ حق کے عذاب جھیلے

حروف کو آفتاب کر دے

عدم سے مجھ کو ثبات کر دے

وجود کا تلاطم

لبالب بھرے دل کے خونی پیالے
اٹھالے، چڑھالے، چرالے، گرالے
رگوں کے گھنی گتھیوں جیسے جالے
ازل سے بھی پہلے کے زندہ حوالے
یہ ریشوں کی سٹکی پہ خواہش کی چربی
کھلے جب کبھی تو ہمیں باندھ ڈالے

کہیں پر رگِ جاں طنابِ جنوں ہے
کھچے ایسے اندر کہ بس گھوٹ ڈالے

شفق کی یہ ہیبت، یہ کرنوں کے ہالے
کبھی تو تمازت کی دنیا اٹھالے
وجود زیاں کی حدوں تک، کے پالے
گماں سے پرے تک جہاں کو اجالے؟
بچالے خدایا، ہمیں تو بچا لے

لوحِ محفوظ سے کلام

ہمیں تعبیر لکھنا ہے
زمانے جاگتے ہیں
میری دھرتی کی نگاہوں میں
صحیفے خواب کے چپ چاپ ہیں
ہمیں تفسیر لکھنا ہے
ہمیں تعبیر لکھنا ہے

بہت سی آہٹیں جو
وقت کے آئینے میں برفاب بیٹھی ہیں

انہیں بیدار کرنے کی
کوئی تدبیر لکھنا ہے
ہمیں تعبیر لکھنا ہے

ہمارے سب سفر محبوس ہیں
پرکار کی حد میں
کسی زندہ مسافت کی
رہِ جاگیر لکھنا ہے
ہمیں تعبیر لکھنا ہے

بہت پہلے
کہ تارے جگمگاتی فصل بونا
بھول جائیں
اجالے راکھ ہو جائیں
سویروں کو نئے نامے
نئی تحریر لکھنا ہے
ہمیں تعبیر لکھنا ہے

دوسرا جنم

تیرے لمس کے اجلے پل تک؟
ممتا سے میں مِلنا سیکھی

تیرا پیارا بوجھ اٹھا کر
دور گگن، تک اڑنا سیکھی

کلکاری کی رُت جب مہکی
دریاؤں سا بہنا سیکھی

تیری ہنسی سے ہنسنا آیا
رونے سے پھر رونا سیکھی

پاؤں پاؤں چلنے لگا تُو
ایسے لگا میں چلنا سیکھی

تیری آنکھ کی گیلی چُپ سے
جیون درد کا چکھنا سیکھی

تیری پیار کی رُت میں پگھلی
سو سو رنگوں ڈھلنا سیکھی

تجھ کو گود میں بھر کے میں تو
ہر مشکل سے لڑنا سیکھی

اِک مُسکان کی خوشبو اوڑھے
پھر پھولوں سا کھلنا سیکھی

ماں تیری اے میرے جنمے!
تجھ میں رہ کر جینا سیکھی

درد ہی درد ہے

شام میں سرمئی رنگ دہکا ہوا
سانس در سانس بارود مہکا ہوا
آدمی آدمیت سے بہکا ہوا

آنکھ کاجل کے بدلے دھواں گھولتی
سوگ میں زندگی زلف کو کھولتی
صحن در صحن ماتم کی لو ڈولتی

خاک لاشوں کی فصلوں سے سرسبز ہے

کوکھ تک لوریوں کی زباں سرد ہے

الاماں! الاماں!! درد ہی درد ہے

شیزوفرینیا

مٙیں کوہ قافِ ازل پہ بیٹھی
شعور سیڑھی کو کھینچتی ہوں
مرے زمانے کھِسک رہے ہیں
حروف رستہ بھٹک رہے ہیں
تمام ہندسے کھٹک رہے ہیں
یہ خواب دامن جھٹک رہے ہیں

یہ لو !
صحیفوں کے خاکداں سے

یقین چھلکا

لرزتے ہاتھوں سے خواب بکھرا
عروج سے اس زوال تک میں
سماعتوں کی جھلستی خو سے
دہک رہی ہوں
شعور کی بے شعور دنیا
بھٹک رہی ہوں

جنم

زمین کی خون آلود پیاس
اس کے وجود میں
بہہ رہی ہے

آسمان کی آنکھ
زمین کی برہنہ خواہش کو دیکھ کر
ٹھٹھر رہی ہے

خیال کسی مزید وصال کے لیے

زمین کے بانجھ پن کو
فروغ دے رہا ہے

اور وہ کسی کے دسمبریں دن
سینکنے کے لیے
ایک خواب کی صورت
ریت میں
دھنسا ہوا سلگ رہا ہے
........جنم لے رہا ہے

انٹرنیٹ استھان کی ملکہ

انٹرنیٹ استھان پہ بیٹھی خواب کی ملکہ!
مخمل سی پوروں سے کتنے روز بنو گی؟
خواب کی ریکھا
رنگ رنگیلے بیر بہوٹی جیسے لفظوں کی انگنائی
جلتی بجھتی تصویروں کی خواب سرائی
ثابت انگوروں کے دانوں جیسی
دنیا کی یہ ہوش ربائی
تنہائی کی گاگر سے پھر لمحہ چھلکا
انٹرنیٹ استھان پہ بیٹھی خواب کی ملکہ!

دور کسی کیفے میں بیٹھے
خواہش اور محبت کے یہ اجلے سائن
یہ جلتے ہونٹوں کے خط،
یہ ہنسنا رونا
سب کچھ آدھا سچ ہے
آدھے سچ میں ڈوب مرو گی
گورکھ دھندا بس اک پل کا
انٹرنیٹ استھان پہ بیٹھی خواب کی ملکہ !
چیٹنگ روم میں
سرد دلوں کے رش میں گھٹتی سانسیں
انسانوں کے چہرے پہنے
جذبے کھائیں روح چبائیں
تنہائی کے روپ رنگیلے رقص دکھائیں
حرفوں کے بجھتے انگارے
کتنے دن تک اور چنو گی؟
پیاس تو مانگے رستہ جل کا
انٹرنیٹ استھان پہ بیٹھی خواب کی ملکہ!

عظمیٰ کے نام

بہنا!
تیرے خواب محل کو
دیمک ذہن کی چاٹ گئی کیوں؟

بہنا !
تیرے شوق کی شوخی
دن کی طنابیں کاٹ گئی کیوں؟

بہنا !

تیری عمر کی اجرت

حرف کی لذت چاٹ گئی کیوں ؟

بہنا !

تیری صبح کی نرمی

رات کی دیوی کاٹ گئی کیوں؟

بہنا !

تیری آنکھ کے نوحے

روشن دن پر سل کی صورت پڑے ہوئے ہیں

نیند سے پہلے، خواب ہی خود کو نگل گئے ہیں

شعور کی کربلا سے

حسینؑ تنہا کھڑا ہوا ہے
فراتِ حق کی نڈھال موجیں
ہمارے ذہنوں کے ساحلوں پر
خود اپنے چہروں سے
منھ چھپائے ہوئے پڑی ہیں

ہماری فکروں کے سرد لاشے
زمینِ کربل کے زرد سورج کے
آبلوں سے اَٹے ہوئے ہیں

انھیں کفن بھی نہیں ملا ہے
حسینؑ تنہا کھڑا ہوا ہے

منافقت کے یزید اب تک
خیامِ شاہِ حرم پہ نیزے گرا رہے ہیں
اسیر زینبؑ کے آنچلوں کو جلا رہے ہیں
یہاں تلک کہ ہر ایک گودی میں آنے والا
عظیم سچ بھی بِلک رہا ہے
حسین تنہا کھڑا ہوا ہے

ہماری راتوں میں اب تلک اس
حرم کی شامِ غریب جیسا
ملال اور خوف جاگتا ہے

ہمارے حرفوں کا سچ مقیّد،
ضمیر قیدی
کہیں سے ہم کو پکارتا ہے
حسینؑ تنہا کھڑا ہوا ہے

سو آؤ ذہن و شعور کی کربلا سے
فراتِ حق کے نئے دنوں کا
یہ آب لے لیں
کہ آؤ هل من کی اس صدا کا
جواب دے دیں

وہی فاصلے ہیں

کہیں بھی کچھ نہیں بدلا
وہی تم ہو،
وہی میں ہوں
وہی روزِ ازل کے فاصلے
چہروں پہ لکھے ہیں
وہی سہمے ہوئے سے اجنبی لہجے
وہی ان کے روّیے ہیں
وہی جذبوں کے کچھ بے آب دریا ہیں
جنہیں ہم روز پیتے ہیں

وہی تم ہو
غموں کی لذتیں تنہا چھپائے ہو
وہی میں ہوں
کہ جلتی ریت کے خوابوں پہ چلتی ہوں
وہی تنہائیاں جن کے سبھی
الفاظ گونگے ہیں
وہی کچھ منتظر لمحے
جہاں، دکھ سانس لیتے ہیں
کہیں بھی کچھ نہیں بدلا
کہیں کچھ بھی نہیں بدلا

منی پلانٹ

پرائے اجنبی آنگن میں
ڈالر اور درہم کے لیے
سینچا گیا ہوں
یہ مرے سبزے کی خوبی تھی
جبھی تو مجھ کو دھرتی سے
نکالا مل گیا تھا
اور اب اس اجنبی بوتل میں
میرے سبز رہنے کے ہنر کو
آزمایا جا رہا ہے

مرے اپنے وطن کی خاک سے
مجھ کو بچایا جا رہا ہے
چھپایا جا رہا ہے
مجھے ویران کر کے گھر سجایا جا رہا ہے
غلامی اور تنہائی
مرے اس فن کا نذرانہ ۔
روپیا میرے جینے کا بہانہ
پرائے اجنبی ملکوں میں......

وقت کی قید میں روشنی

ٹرالر کی گھوں گھوں
ٹرالی کی گھڑ گھڑ
تھکے ماندے کم زور جسموں کی حرکت
برستی ہوئی بارشوں سا پسینہ
سپروائزر کی نگاہوں کی ہیبت
تپش کی صعوبت!
دھنسی پتلیوں میں امنڈتی سی حسرت
قدم اتنے بھاری کہ صدیاں بندھی ہیں
طنابیں زمانوں کی حیراں کھڑی ہیں
زماں چل رہا ہے مگر یہ وہیں ہیں

معیشت کے جبڑوں میں نانِ جویں ہیں
غریبوں کے ملکوں سے اٹھ کر یہ ڈھانچے
بڑی بلڈنگوں کی رگوں کے مکیں ہیں
وہ پردیس ہو یا کہ اپنا وطن ہو
کہیں پر بھی ہوں
یہ وہیں کے وہیں ہیں

جبر کے نام

گولیاں، وردیاں، سیٹیاں، لاٹھیاں
جبر کے شہر میں تشنگی!
الاماں!!
ہونٹ پر سوکھتی خوف کی پپڑیاں
آنکھ میں کچھ لرزتی سی خاموشیاں
خارداری نظر میں گِھرے آسماں
ہُوک میں دفن ہیں، زندگی کے نشاں
خونِ نمکین سے بھیگتی ہے زباں
شہرِ بارود میں منجمد بالیاں

ہر طرف گھومتے اہلِ بندوق ہیں
اسلحے سے بھرے دل کے صندوق ہیں
بکتروں میں پڑی اپنی تقدیر ہے
کیا یہ دھرتی تری ماں کی جاگیر ہے؟

اختیار

کیا ابھی تلک دل پر
اختیار باقی ہے
ناظرینِ ہستی کو
جبر کے تماشے میں
دیکھنا ہے کیا کیا کچھ
انتظار باقی ہے!
مٹھیوں میں لوہے کی
ساعتیں گلابی ہیں

جبس کا زمانہ ہے
کھیل سے کھلاڑی تک
دل خموش روتا ہے
سوگوار باقی ہے
اختیار باقی ہے

کھل رہی تھی جب شبنم
جل رہا تھا گل کوئی
آنکھ نم ہوئی میری
شب کی اجلی چادر پر
ہونٹ رکھ گیا کوئی
زخم زخم موسم میں
ایک پیار باقی ہے
اختیار باقی ہے!

اَلف اکیلی تنہائی

یہ اَلف اکیلی تنہائی ،
گودی میں جسم کی مٹّی ہے
ہر دل کی اپنی بھٹّی ہے
جھلسا آئی
یہ تنہائی
یہ اَلف اکیلی تنہائی
رُت ٹانکے کھول کے دیکھے گی
ہر بھیتر کو اب کھودے گی

میں بھر پائی !
یہ تنہائی !
یہ اَلف اکیلی تنہائی

جب کھیت بلائیں خوابوں کے
ہل جوتے جائیں وعدوں کے
کیا بو آئی ؟
یہ تنہائی !
یہ اَلف اکیلی تنہائی

ہُو وقت کی لَو پر ناچے گی
اس خون کا چرخا کاتے گی
خوں رت آئی
یہ تنہائی !
یہ اَلف اکیلی تنہائی

کھل جا سم سم

آ گہی پکار و تو
ہم کہ راہ رُو دل کے
ہم مسافرِ ہستی
کھل رہے ہیں خوابوں میں
دفن تھے سرابوں میں
زندگی پکار و تو

منجمد لہو کو کھینچ
گرمیءِ زمانہ بھینچ

خاک سے نکالو تو
تشنگی پکارو تو

اذن دے نئے دن کو
سورجوں کی کرنیں کھول
پیاس میں سنبھالو تو
آگہی سنوارو تو
جبر کے اندھیروں میں
خوف بستہ شامیں ہیں
دست بستہ آنکھیں ہیں
روشنی میں ڈھالو تو
زندگی پکارو تو......

خیالِ کُن کا الاؤ

برستی بوندوں کی خواہشوں میں
خلائے نم کا الاؤ ہوتا
خیالِ کُن کا لگاؤ ہوتا
گلالِ گل کا سجاؤ ہوتا
اُمنڈتی رت کا بہاؤ ہوتا
سمندروں کا چڑھاؤ ہوتا

مگر یہ ساحل کی اشتہا کو
نہ جانے کیسا نمک لگا ہے

کہ اجلی شامیں
ہر ایک آنگن
بدن دریدہ کھڑی ہوئی،
چپ سے پوچھتی ہیں؟
یہ صبح گریہ اٹھائی کس نے؟
یہ کچی بستی گرائی کس نے؟
مہکتی رت یہ گنوائی کس نے؟
دیئے کی باتی بجھائی کس نے؟

فنا کی انجمن سے

بڑی گھٹن ہے
سوالِ ہستی تو ہانپتے ہیں
نظر کو عریانیاں ملی ہیں
کسے کہوں کہ
یہ مرے جذبوں کا باس پن ہے
بڑی گھٹن ہے

جو سر بکف تھے،
گرے پڑے ہیں

جو گل شفق تھے،
وہ نالیوں سے ابل رہے ہیں
کسی جہنم کی سی جلن ہے
بڑی گھٹن ہے

کوئی تو روزن
کوئی دریچہ
کہیں دراڑوں سے کوئی رستہ
فنا کی لمحوں کی انجمن ہے
بڑی گھٹن ہے

خود سے رہائی کی استدعا

میں بے یقینی کے سرد موسم میں
برف لمحوں سے مر رہی ہوں
گمان پہنے صراط دل پر
سنبھل کے ....
خود میں پگھل رہی ہوں
کہاں تلک ہو
غلام و آقا کی پاسداری

کہاں سے آئی یہ میری
''میں'' کی لہو سواری

رہائی دے دے....
میں سانس باندھے
بہت دنوں سے
حضور دل کے
کھڑی ہوئی ہوں

امکان کا آئینہ

ادارہ برائے بہبودِ آبادی
پنکھڑی کو کاٹنے کے لیے درانتی تیار کر رہا ہے
عالمی ادارۂ خوراک
دودھ کی بوتلوں میں
کھانسی کے نشہ آور شربتوں کی کھیپ روانہ کر رہا ہے
نادرا کی جانچ کمیٹی نالیوں میں پڑے
غباروں کی تعداد سے مردم شماری کی رپورٹ تیار کر رہی ہے

کونسل برائے زرعی اجناس
اگلی فصل کے لیے

کسانوں میں بھنے ہوئے بیج تقسیم کر رہی ہے

فوجی فرٹیلائزر

ملکی زرخیزی کے لیے

تھور سے کھاد کی بوریاں تیار کر رہی ہے

عالمی ادارہ برائے امن

ریسلنگ کے کھیل کو

اسپانسر کر رہا ہے

میڈیا پر خبریں جُگالی کرنے والے

روز بہ روز تنومند ہوتے جا رہے ہیں

زمانے!

تیرے امکان کا آئینہ ٹوٹتا جا رہا ہے

ہزاروں خواہشیں ایسی...

کاش میں سمندروں کا نمکین پانی ہوتی
نیلی روشنائی پہن کر
بند سیپیوں کے راز چراتی
جل پریوں سے دوستی کرتی
عکس کے زاویے تراشتی
لہروں کی گود میں بیٹھ کر
دھرتی کو اپنا سنگھار دکھاتی

مگر کناروں کے بازوؤں میں سانس
گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا ہے
کاش میں روشنی کی ماں جائی ہوتی

جو مجھے کانچ کے کھیل سے نکال کر
حسن کے آسماں تک کی سیر کراتی
تاریکیوں کا منہ چڑھاتی
رنگوں کی اپسراؤں سے سنگھار کراتی
مگر مجھے
جلنے، بجھنے کے مستقل عذاب میں رکھا جا رہا ہے
کاش میں تمہاری محبت کی محبوبہ ہوتی
جو مجھے زمانوں سے کھینچ نکالتی
کناروں سے آزاد کراتی
کرنوں سے زیادہ برق رفتار بناتی
وقت سے زیادہ تکمیل دے جاتی
مگر ....
روح کو جسم کا وبال بنانے سے خوف آ رہا ہے

ہریالی کی چیخ

رُت کے پنچھی کے پر
بھیگ چکے ہیں
چڑیا گیلی شاخ پہ بیٹھی
لرز رہی ہے
گندم کی بالی
لہروں کے بیچ پھنسی ہے
ہریالی
پانی کے اندر چیخ رہی ہے
ہلکے ہلکے خواب سطح پہ تیر رہے ہیں
صحنوں کے خوابیدہ بستر پر

لہروں کے بھاری جسم پڑے ہیں
بنیادوں کی مٹی نے
پانی میں گدلی خاموشی کا چولا پہن لیا ہے
بھوک نے اپنے خونی پنجے
دن کے بھیتر گاڑ دیے ہیں
گیلی لکڑی چولھے میں سے
دھویں کے بادل کھانس رہی ہے
خوف کی دکانوں کا کاروبار
سوا نیزوں پر چمک رہا ہے
بادبان کا ہوا سے جھگڑا
گردن گردن ڈوب چکا ہے
مانجھی کی آنکھیں اپنی حد تک
سارے کنارے مسل چکی ہیں
امیدوں کی صبحیں
رستہ بھٹک چکی ہیں
دھرتی کو کچھ خونی لہریں نگل رہی ہیں

پرندے مسکراتا آسمان چاہتے ہیں

اونچی اونچی عمارتوں کی
ٹھنڈی جالیوں پر لٹکے
بچے کھچے پرندے
خاموشی چاہتے ہیں
آزادی چاہتے ہیں
صبح کی تازہ اُڑانوں کے لیے
تھکے ماندے دھویں میں اٹے
پرندے زندگی چاہتے ہیں
آزادی چاہتے ہیں
گاڑیوں کی ترتیب سے بچ بچا کر نکلتے ہوئے

عظیم جہازوں کی اڑانوں سے

ڈرتے ہوئے پرندے

تنہائی چاہتے ہیں

آزادی چاہتے ہیں

پلاسٹک کی تھیلیوں سے بھری

سیوریج لائینوں کے کنارے

پیاس پیتے ہوئے پرندے

مکمل سیرابی چاہتے ہیں

آزادی چاہتے ہیں

تمنا کی پہلی اڑان کا

امکان چاہتے ہیں

زندہ جہان چاہتے ہیں

مسکراتا آسمان چاہتے ہیں

رحمٰن باباکے مزار پر!

رحمٰن بابا!
رباب کے تار آزردہ ہیں
جذب وجنوں کی ادھوری دھنیں
آپ کے مزار کے ڈھائے گئے ستونوں میں دبی
چیختی ہیں
رحمٰن بابا! آپ کی الوہی خوش بو میں
ڈولتی زمین انسانی خون میں رنگی ہے
آپ کے لفظوں کی بسنت میں ڈولتی فضا
درس گاہوں کی ٹوٹی چھتیں بھگو۔۔رہی ہے
رحمٰن بابا!

دھمال ڈالتے مست فقیروں کے پاؤں
باندھ دیے گئے ہیں
من موجے گبھرو
ماؤں کی حیات سے کم کر دیے گئے ہیں
دھوپ، چھاؤں سے اٹکھیلیاں کرتی
کبوتریوں کی اڑانیں
ضبط کر لی گئیں ہیں
ارمانوں کڑھی، مزار کی چادریں
بھسم کر دی گئی ہیں
رحمٰن بابا!
اندھیرا صبح کو نگل جانے کے لیے
پیش قدمی کر رہا ہے

بے نام مرنے والوں کے نام

چپ کی تعمیر سے پہلے کا سفر
کون لکھے گا؟
کسے یاد ہے اب؟
کاسۂ جسم میں ایک آگ سی تھی
لوح گرداب کی اک رات سی تھی
درد کی سازش ادراک سی تھی
سانس احساس کی رفتار سی تھی
خون تیزاب کی تاثیر سا تھا

آنکھ روشن تھی

کہ شعلہ سا رواں ہوتا تھا

لب زماں ساز زمانے سے سبک کھلتے تھے

انگلیاں جذب میں ہر پور بندھی آتی تھیں

کان امید کی آہٹ پہنے

پیر بے تاب تمنا باندھے

رقص کے نام پہ گم ہو بھی چکے

نام فہرست سے

کم ہو بھی چکے

کون اب ان کی زبانی لکھے

اور اب ان کی کہانی لکھے

کون لکھے گا کسے یاد ہے اب

چپ کی تعمیر سے پہلے کا سفر

نئی دنیا کی حیرت میں

میں سوچوں
برف اور شہد کی رنگیں کہانی کو
مگر
خونی رتوں کے ذائقے ٹھہرے زبانوں پر
میں سینچوں
کونپلوں کو پھول کی پہلی جوانی تک
مگر
دھرتی میں اب کے آگ بیٹھی ہے
میں لکھوں

ساحلوں، آبی پرندوں کو
مگر پانی میں پھیلی
تیل اور بارود کی بھاری کثافت
میری سانسیں
کھینچ لیتی ہے
میں دیکھوں
آسمانوں کی شفق تک
کھیل لک چھپ کا
مگر میزائلوں، جنگی جہازوں کی اڑانیں
آسماں میں چھید کرتی ہیں
میں جنموں
مسکراہٹ اور کلکاری کی رم جھم کو
مگر جنگوں کی دہشت
خوف جنتی ہے

میں بیٹھی ہوں
کھلے آنگن میں لیکن
قیدی لگتی ہوں....

میں کیا سوچوں !

میں کیا دیکھوں !!

میں کیا سینچوں !!!

میں کیا لکھوں !!!!

عورت = لامکانی

کہیں سے مٹی اٹھا کے لائی

خدا بنایا

بدن کی بھٹی میں دل جلایا

ہر ایک خواہش مٹا کے رکھ دی

تمام اطراف اس کی مورت سجا کے رکھ دی

نظر ہواؤں کے نام کر کے

اُڑی پھری تھی

لگا تھا ایسے کہ ایک پل کو
سفر کو ہمراہ لے چلی تھی
مگر ہواؤں کا کیا بھروسا
زمیں نہیں آسماں نہیں ہے
صحیفے لفظوں سے ڈر رہے ہیں
یہ پھول پوجا کے مر رہے ہیں
ہمارے ہمراہ لامکانی
ہر ایک عورت کی اک کہانی

ماروی وقت کی قید میں

ماروی وقت کی قید میں۔

وقت وہ،

جو کہ فرعون تھا

جو کہ نمرود ہے

وقت جو کہ، تماشہ ہر اک گام کا

وقت اب بھی ہے عنوان انجام کا

ایک فرضی حقیقت کے پیغام کا

پید و ناپید میں

ماروی وقت کی قید میں

پھر نئی ماروی وقت کی قید میں!

وقت جو کہ کرنسی زمانے کی ہے

اتنی حرکت، طلب کس ٹھکانے کی ہے

دھڑکنوں کی یہ چھب بس دکھانے کی ہے

اصل میں جیب خالی۔فسانے کی ہے

سود ہے صید میں

ماروی وقت کی قید میں

پھر نئی ماروی وقت کی قید میں!

وقت۔

جو دن میں روتی ہوئی رات تھی

ٹھنڈی جلتی ہوئی ان کہی بات تھی

اونچے محلوں میں گھر کی کہاں بات تھی

ہجر تھا۔زخم تھے۔نت نئی گھات تھی

بود و نابود میں

کیا ملا!؟

مرہم و وید میں

ماروی وقت کی قید میں
پھر نئی ماروی وقت کی قید میں!

وقت کا بادباں صرف چلتا رہا
روح پاٹی گئی کوئی گھر کب ملا
بس خلا در خلا ۔۔
فاصلہ فاصلہ۔۔
عبدو معبود میں
ماروی وقت کی قید میں
پھر نئی ماروی وقت کی قید میں!

وقت کی بانسری، خود سے آگے ملی
راستے چاٹتی، کوئی دیمک چلی
خوف و ادراک کی، ایک اندھی گلی
حد و محدود میں
ماروی وقت کی قید میں
پھر نئی ماروی وقت کی قید میں!

وقت کو سو جانا چاہیے

عبادت گاہ کی سیڑھیاں اور محرابیں
رات بھر کے کہر سے گیلی ہو گئیں
سڑک پہ سوئے فقیر نے
اپنے پھٹے ہوئے کمبل سے بدن لپیٹ لیا
پانی کی سطح پہ رکھی ہوئی خواہشوں سے
رات بھر اتنا تیل رستا رہا
کہ سمندر کثیف ہو گیا

کنارے پر بیٹھ کر مچھلیوں کو
دانہ ڈالنے والے ہاتھ
اپنے اپنے کاموں پر جا چکے
ریت پر بیٹھ کر سرگوشیاں کرتے ننگے پیر
لہروں کے حساب میں مصروف جوڑے
صرف بستروں میں ملاقات کا وقت نکال سکیں گے
مرغابیوں اور کبوتروں کے اجلے پروں پر ہوا
دھوئیں سے نقش نگاری سیکھ رہی ہے
آفتابِ وقت
صبح کے پہلو بہ پہلو
نیند میں جھومتا
ڈگمگاتا
چلا جا رہا ہے

نیا سال

نیا سال آیا!
مرے درد کی پوٹلی ، آج پھر سے کھلی ہے
خرابوں میں اڑتی ہوئی خاک
آنکھوں کو پہچانتی ہے
زمیں قبر میں دفن جسموں کو
ناموں سے کب جانتی ہے
مگر راکھ میں آگ جلتی رہی ہے

نیا سال آیا!
مرے درد کی پوٹلی ، آج پھر سے کھلی ہے
مہکتی ہوئی سرحدِ دل کی جانب

وہی خون آشام بدلی چلی ہے
ہوا پیرہن کو بدل کر
نئی لگ رہی ہے
مگر اصل میں، سال خوردہ وہی ہے
مسلسل وہی خواب جلنے کی بو آ رہی ہے

نیا سال آیا!
مرے درد کی پوٹلی آج پھر سے کھلی ہے
سڑک،
نیو ایئر کے جلے سائنوں سے اٹی
دائروں کے سفر پر جتے بیل....؟
لیکن نہیں.....
گاڑیوں میں مقید رہی ہے

کوئی آرزو
بند شیشوں کے پیچھے سے بس
بتیاں دیکھ کر بجھ رہی ہے
مجھے اس خوشی پر ہنسی آ رہی ہے

نیا سال آیا!
مرے درد کی پوٹلی، آج پھر سے کھلی ہے
زماں
سنیما گھر کی پچھلی نشستوں پہ بیٹھا
مزے لوٹتا ہے
کسی نیم عریاں لبادے میں لپٹی ہوئی
زندگی ناچتی ہے
دھڑکتے ہیں دل بھی۔
مگر نبض کب چل رہی ہے

نیا سال آیا!
مرے درد کی پوٹلی، آج پھر سے کھلی ہے
نیا سال آیا! خدایا!
نیا سال آیا تو ہے
پر نیا دن نکالو
نیا کوئی سورج
نیا چاند اب کے اتارو
مری بستیوں میں

پرانی وہی خاک کیوں اڑ رہی ہے
نیا سال آیا!
مرے درد کی پوٹلی، آج پھر سے کھلی ہے

موت حیران ہے

ابھی کچھ دیر پہلے
اس جہاں کی زندگی ،تابندگی
سب دیدنی تھی
اور اک پل میں
چھتوں سے چمچماتے قمقموں کی باڑ
جلنے اور بجھنے کی حرارت سے پرے
شعلوں میں اپنا منہ چھپاتی ہے
گلابوں سے بھرے گلدان کی اجلی مہک
جلتے ہوئے زخموں میں لپٹی ہے
زمیں پر ٹائلوں کے آئینے . . .

اب راکھ کے رنگوں سے گھائل ہیں
گلاسوں میں پڑے مشروب
ہونٹوں کے ملائم لمس
سے عاری ہیں،
گم صم ہیں!
پلیٹوں میں ادھورے ذائقے
اب اپنے مہمانوں کی ساکت،
خون آلودہ زبانوں ہی کا نوحہ ہیں
بجھی سارنگیوں پہ ہاتھ
اپنی چپ میں ڈوبے ہیں
جلے طبلوں کی لے اب تک
دھماکے کے کسی پل سے
مسلسل ایک ہیبت ناک سر میں
ہُوکتی۔۔۔۔روتی۔۔سسکتی ہے

موت ..... دیپک راگ... اپنے اوج پر ہے
سوئمنگ پول کا شفاف پانی
آگ کے شعلوں کی

حدت سے پریشان ہے
یہاں کی زندگی پر
موت حیران ہے

حیرت کدہ

گریباں سے پہلے یہ گردن،
تو گردن سے پہلے؟!
مہربان مہروں کی خود پر چڑھائی
قلم روشنائی سے پہلے یہ انگلی
تو انگلی سے پہلے رگوں کی ترائی
صداؤں سے پہلے دہن، یہ زباں
اور ان سے بھی پہلے ـــ
یہ عصبی کڑھائی

تماشے سے پہلے یہ پتلی
سفیدی کی عریاں طنابیں
تو اس سے بھی پہلے
اندھیری لکیروں کی کھائی

سفر!
تجھ سے پہلے قدم
اور اس سے بھی پہلے
ارادوں کی ہیئت کذائی
مرے دل میں تُو.....تیری خواہش
تری خواہشوں سے بھی پہلے
گپھاؤں کا باسی تنفس
مرے جینیاتی نظاموں کی پہلی لکھائی
تو پہلے سے،
پہلے سے
پہلے کی کیسی جدائی؟

بلندی کے تماشے میں

برج خلیفہ!

مجھے تمھاری شفاف

سیڑھیوں پر ٹوٹے پھٹے،

مسافرت کی مٹی سے اٹے،

جوتوں کی چاپ چیختی دکھائی دے رہی ہے

سنگ مرمر کی دیواروں پہ

جبر سے چیختے، غذا کھودتے، روٹیاں نوچتے،

ہونٹوں کا لمس محسوس ہو رہا ہے

برج خلیفہ!

تمھارے بار روم کے ریک میں

الٹے کرسٹل گلاس میں

زمانوں کی اوندھی قسمت نظر آ رہی ہے

کھڑکیوں آئینوں میں ڈولتے ہوئے

حسیں مرمریں جسم

سبز خوابوں کی موت نظر آ رہے ہیں

برج خلیفہ! ☆

مجھے حسن کے یہ سارے استعارے

یہ آسمان چھوتے ہوئے کنارے

بہت بے وقعت اور ہیچ نظر آ رہے ہیں

☆ برج خلیفہ دبئی کی بلند عمارت

حُسن بانو!

ازل سے
کڑے، نت نئے ضابطوں میں
مرا جسم سی کر، مرا حسن ہی تو مجھے
ساتویں آسماں سے زمیں پر گراتا رہا
خواب گاہوں میں لا کر سلاتا رہا
یہ کاکل کے بل....
میری سانسوں کے پھندے ہیں
میں جن کی سولی چڑھی ہوں

مرے نقرئی ہونٹ کی سرخیوں کے تلے
میرے اعجاز، زخمی پڑے ہیں
مگر آئینے میں
زمانے کی مکروہ صورت

مرے خواب کو منہدم کر رہی ہے
مجھے جھریوں سے بھرے
پوپلے
دو دھنسی پتلیوں میں دبے
خواب کی پھر سے تزئین کو
کوئی مشاطہ دو۔
اس خلائے ازل میں گندھے دل کے بہلانے کو
کوئی حرافہ دو۔
یہ چمکتی لپکتی ہوئی
سطح پر تیرتی منعکس
کس کی تقصیر ہے

حسن بانو !
کیا ترے پاس
اس وقت کے
دائروں سے نکلنے کی
اچھی سی تدبیر ہے!
حسن ہی اپنے پیروں کی زنجیر ہے

☆☆☆

ثروت زہرہ کے ہاں کچھ بھی ایسا نہیں ہے جسے میں قالین کے نیچے چھپانے کی کوشش کروں گا، لیکن جو کچھ ہے وہ کئی سطحوں پر بحث کی زد میں لایا جا سکتا ہے۔

ثروت جدید شاعرہ ہیں لیکن 'جدیدیت' کی اس حد تک حامی نہیں ہیں کہ وہ افشار و انتشار پر تکیہ کرتے ہوئے اپنے نفسِ مضمون سے ہی بھٹک جائیں۔ ان کے ہاں تجریدی آرٹ کے وہ جدید فیچر نہیں ہیں، جن سے مثنیٰ یا مشابہت سے آگے بڑھ کر کسی فوٹو گراف کی غیر مساوی، خصوصی طور پر ایسی وسیع الذیل تصویر پیش کی جاتی ہے کہ اصلی تصویر اس میں دکھائی ہی نہیں دیتی یا تصغیریہ کی سطح پر اسے minimise کرتے ہوئے ایک لایعنی نقطہ بنا دیا جاتا ہے۔ وہ اگر آرٹسٹ ہوتیں تو بھی شاید سرّیلزم پر تکیہ کرنے کے بجائے representational painting کرتیں لیکن کہیں کہیں سرّیلزم کا سہارا بھی لے لیتیں۔ ان کی سطر کی کشید نسبتاً مختصر ہے، لیکن لخت لخت سطور کے التزام کے باوجود ان کی نظموں میں تسلسل ہے، استحکام ہے، پائیداری ہے، Organic Unity ہے۔ اگر بوقلمونی یا رنگا رنگی ہے تو وہ بھی اس توافق کو مجروح نہیں کرتی۔ اس لحاظ سے ان کے ہاں استعارے کی سطح پر "مشبہ بہ" اور "مشبہ" میں one-to-one-equation بخوبی موجود ہے۔ اگر موضوعاتی سطح پر وہ ایک آگاہ شاعرہ ہیں تو اسلوبیاتی سطح پر بھی وہ زبان و بیان کے رموز سے واقف ہیں۔

ستیہ پال آنند

ثروت کے پاس جو ہنر ہے توفیق شعر ہے اور فن ہے اس پر ہمیشہ اور ہر وقت بات کی جاسکتی ہے۔ثروت کی شاعری میں اصناف کا پھیلاؤ ہے۔نظم آزاد بھی ہے اور معریٰ بھی ہے نثری بھی ہے اور غزل بھی۔نظم کہنے کے طریقوں اور ڈکشن کے اندر لفظیات اس کے اپنے پیشے اور مطالعے سے لی گئی ہیں۔امیجز اس کے ماحول سے آئے ہیں اس لئے تازہ لگتے ہیں۔ایک ذہین عورت ہوتے ہوئے اس نے عورت کے دکھ کو محسوس کیا، یہ ان کا قدرتی جذبہ اور فطری اظہار ہے جو ایک اہم رویہ ملتا ہے وہ ہے جنس کی طرف ان کا کھلا اظہار، اور مجھے خوشی ہے کہ ثروت نے اس کو اسکینڈلائز نہیں ہونے دیا وہ ایک نباض کی طرح ایک طبیب کی طرح انسان کے جسموں سے بھی آشنا ہیں اس اور ان کے مسائل سے بھی آشنا ہیں۔

پروفیسر احسان اکبر

پڙهندڙ نَسُل . پَ نَ

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾ عبدالله حسين ” اُداس نسلين“ نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻِڪَ ”لُڙهندَڙ نَسُل“ نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندَڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻَرندڙ، ڇُرندڙ، ڪِرَندڙ، اوسيئڙو ڪَندَڙُ، ياڙي، ڪائُو، ياجوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سَگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سڀني وِچان ”**پڙهندڙ**“ نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان کڻي ڪمپيوُٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعني e-books ٺاهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌڻ، ويجهَڻ ۽ هِڪ ٻِئي کي ڳولي سَهڪاريِ تحريڪ جي رستي تي آڻِڻَ جي آسَ رکون ٿا.

پَڙهندڙ نَسل (پَـنَ) ڪا بہ تنظيمَ ناهي. اُنَ جو ڪو بہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجهندڙ نہ آهي. جيڪڏهن ڪو بہ شخص اهڙي دعوىٰ ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو ڪُوڙو آهي. نہ ئي وري پَـنَ جي نالي ڪي پئسا گڏ ڪيا ويندا. جيڪڏهن ڪو اهڙي ڪوشش ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو بہِ ڪُوڙو آهي.

جهڙيءَ طَرَح وڻن جا پَنَ ساوا، ڳاڙها، نيرا، پيلا يا ناسي هوندا آهن اَهڙيءَ طرح پڙهندڙ نَسُل وارا پَنَ بہ مختَلِف آهن ۽ هوندا. اُهي ساڳئي ئي وقت اُداس ۽ پڙهندڙ، بَرندڙ ۽ پڙهندڙ، سُست ۽ پڙهندڙ يا وِڙهندڙ ۽ پڙهندڙ بہ ٿي سگهن ٿا. ٻين لفظن ۾ پَنَ ڪا خُصوصي ۽ تالي لڳل ڪِلَب Exclusive Club نہ آهي.

ڪوشش اها هوندي تہ پَنَ جا سڀ ڪَم ڪار سَهڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پر ممڪن آهي تہ ڪي ڪم اُجرتي بنيادن تي بہ ٿِين. اهڙي حالت ۾ پَنَ پاڻ هِڪَٻِئي جي مدد ڪَرڻ جي اُصولَ هيٺ ڏي وَٺُ ڪندا ۽ غيرتجارتي non-commercial رهندا. پَنَن پاران ڪتابن کي ڊِجيٽائِيز digitize ڪرڻ جي عَملَ مان ڪو بہ مالي فائدو يا نفعو حاصل ڪرڻ جي ڪوشش نہ ڪئي ويندي.

ڪتابن کي ڊِجيٽائِيز ڪرڻ کان پو ٻيو اهم مرحلو وِرهائڻ distribution جو ٿيندو. اِهو ڪم ڪرڻ وارن مان جيڪڏهن ڪو پيسا ڪمائي سگهي ٿو تہ ڀلي ڪمائي، رُڳو پَنَن سان اُن جو ڪو بہ لاڳاپو نہ هوندو.

پَنَن کي کُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پٽاندڙ وڌِ کان وَڌِ ڪتاب خريد ڪَري ڪتابن جي ليکَڪَن، ڇپائيندڙن ۽ ڇاپيندڙن کي هِمٿائِن. پر ساڳئي وقت عِلم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪَنهن بہ رُڪاوٽَ کي نہ مڃن.

شيخ اَيازَ علمَ، ڄاڻَ، سمجهہَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽَ، پُڪارَ سان تَشبيهہ ڏيندي انهن سيني کي بَمن، گولين ۽ بارودَ جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:

گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.

... ...

جئن جئن جاڙ وڌي ٿي جَڳَ ۾، هو ٻوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا؛

ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موتي مَنجهہِ پهاڙ ڇُپن ٿا؛

... ...

ڪالههَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄڪلهہ نيلا پيلا آهن؛

گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن........

... ...

هي بيتُ اَٿي، هي بَمر- گولو،

جيڪي بہ ڪٽين، جيڪي بہ ڪٽين!

مون لاءِ ٻنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،

جنهن رِڻ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَ ۽ چَمَ جو ساٿي آ ـ

اِن حسابَ سان اٽڪاٽائي کي ڀاڻَ تي اِهو سوچي مَڙهڻ تہ "هاٽي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نہ وڃايو" نادانيءَ جي نشاني آهي.

پَڙهن جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ ڀاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۽ سماجي حالتن تان نظر ڪڇي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اٽڪاڻ ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَڙَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين

ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بنائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پَڙهندڙ نَسُل جا پَنَ سيني کي **چو، چالاءِ ۽ ڪينئن** جهڙن سوالن کي هر بَيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوٺَ ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي نہ رڳو پنهنجو حق، پر فرض ۽ اٽل گهرج unavoidable necessity سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان بہ پڙهڻ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا، بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها توڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون ياڪِي پائي چيو تہ ”منهنجا ياءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ“.
- اياز (ڪلهي پاتم ڪينرو)